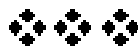
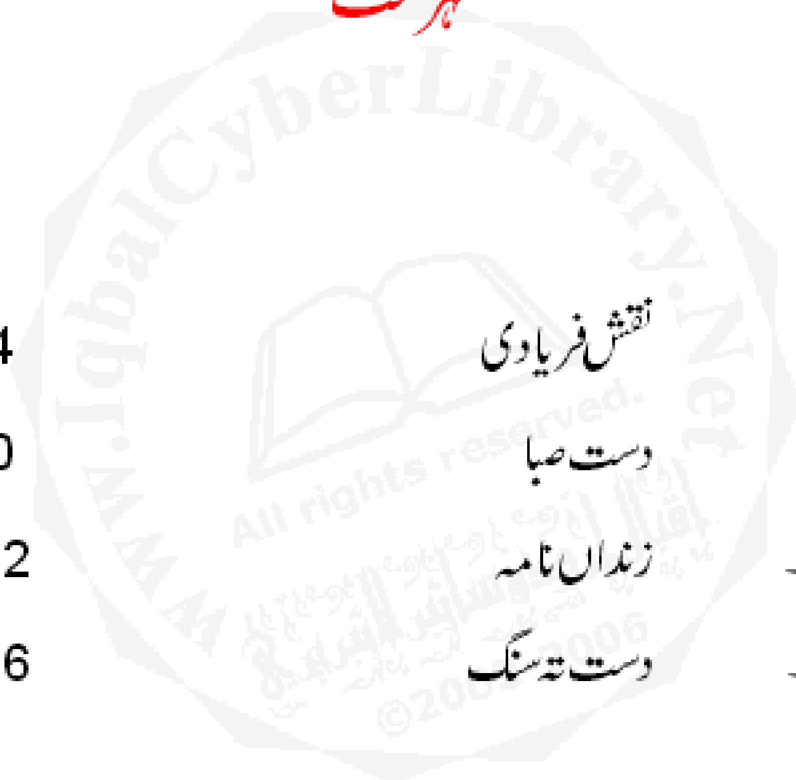
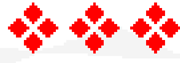
نسخہ ہائے وفا

فیض احمد فیض



فہرست

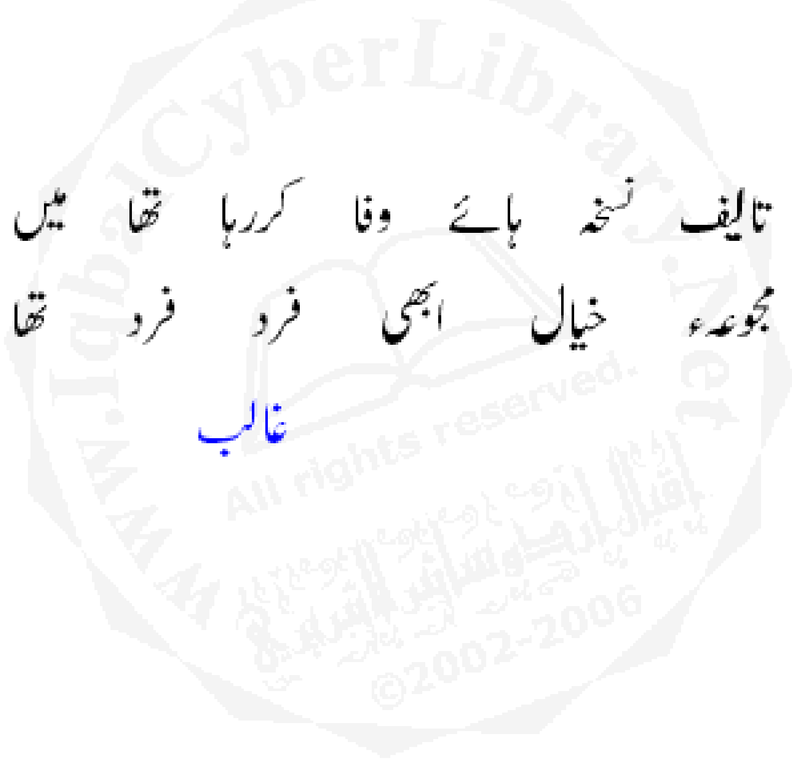




تالیف نسخہ ہائے وفا کررہا تھا میں

مجموعہء خیال ابھی فرد فرد تھا

غالب



نقش فریادی



اشعار

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آئے
جیسے صحراوں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

دل رہین غم جہاں ہے آج
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج
سخت ویراں ہے محفل ہستی
اے غم دوست! تو کہاں ہے آج

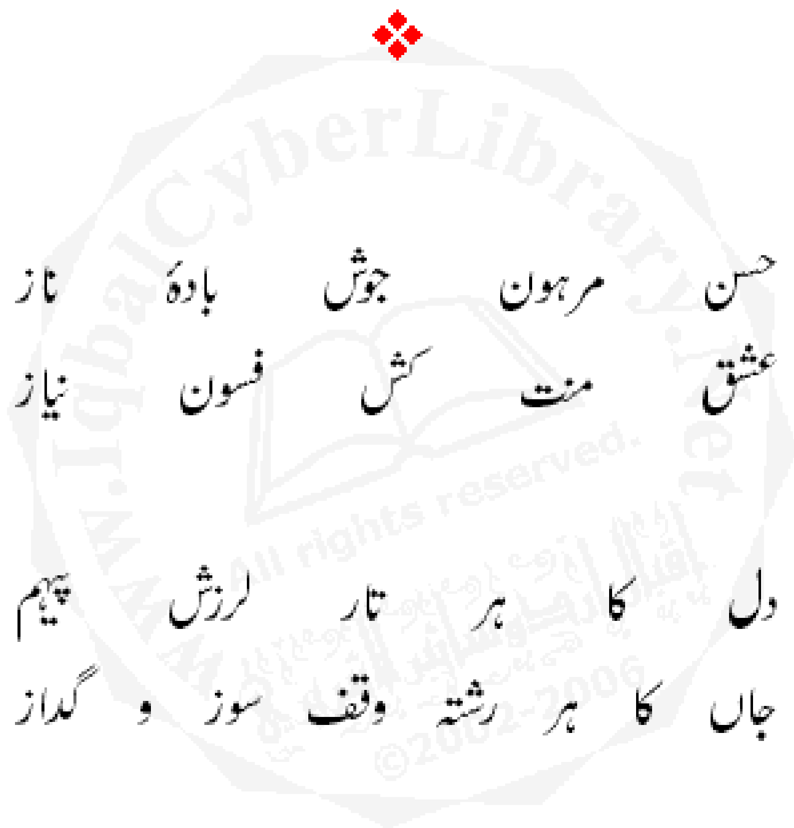
خداوہ وقت نہ لائے۔۔۔۔

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرت پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا
ہجوم یاس سے بے تاب ہو کے رہ جائے
وفور درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرور حسن سراپا نیاز ہو تیرا
طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے
تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے
خزاں رسیدہ تمنا بہار کو ترسے
کوئی جبیں نہ ترے سنگ آستاں پہ جھکے
کہ جنس عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے
فریب وعدہ فردا پہ اعتماد کرے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے
وہ دل کہ تیرے لیے بے قرار اب بھی ہے
وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

(۱)

بروای عقل و منہ منطق وحکمت درپیش
کہ مرا نسخہء غم ہائے فلاں درپیش است

(عرفی)



حسن مرہون جوش بادۂ ناز
عشق منت کش فسون نیاز

دل کا ہر تار لرزش پیہم
جاں کا ہر رشتہ وقف سوز و گداز

سوزش درد دل کسے معلوم!
کون جانے کسی کے عشق کا راز

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گم شدہ آواز

ہو چکا عشق، اب ہوش ہی سہی
کیا کریں فرض ہے ادائے نماز

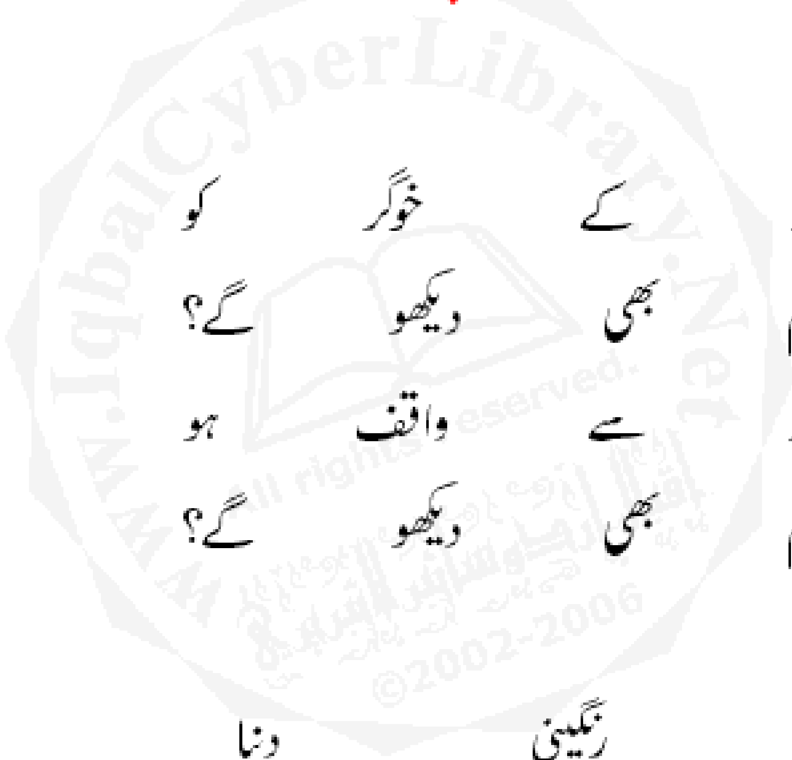
تو ہے اور ایک تغافل پیہم
میں ہوں اور انتظار بے انداز

خوف ناکامی امید ہے فیض

ورنہ دل توڑ دے طلسم مجاز

❖❖❖

انتہائے کار



پندار کے خوگر کو
ناکام بھی دیکھو گے؟
آغاز سے واقف ہو
انجام بھی دیکھو گے؟

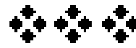
رنگینیِ دنیا سے
مایوس سا ہو جانا
دکھتا ہوا دل لے کر
تنہائی میں کھو جانا

ترسی ہوئی نظروں کو
حسرت سے جھکا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو
آہوں میں چھپا لینا

راتوں کی خموشی میں
چھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے
ملبوس کو دھو لینا

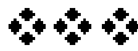


جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بسا لینا
بھولی ہوئی یادوں کو
سینے سے لگا لینا



انجام

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں
محبت کی دنیا پہ شام آ چکی ہے
سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں
مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں
تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں
تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے ستم اور میری وفائیں
مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں



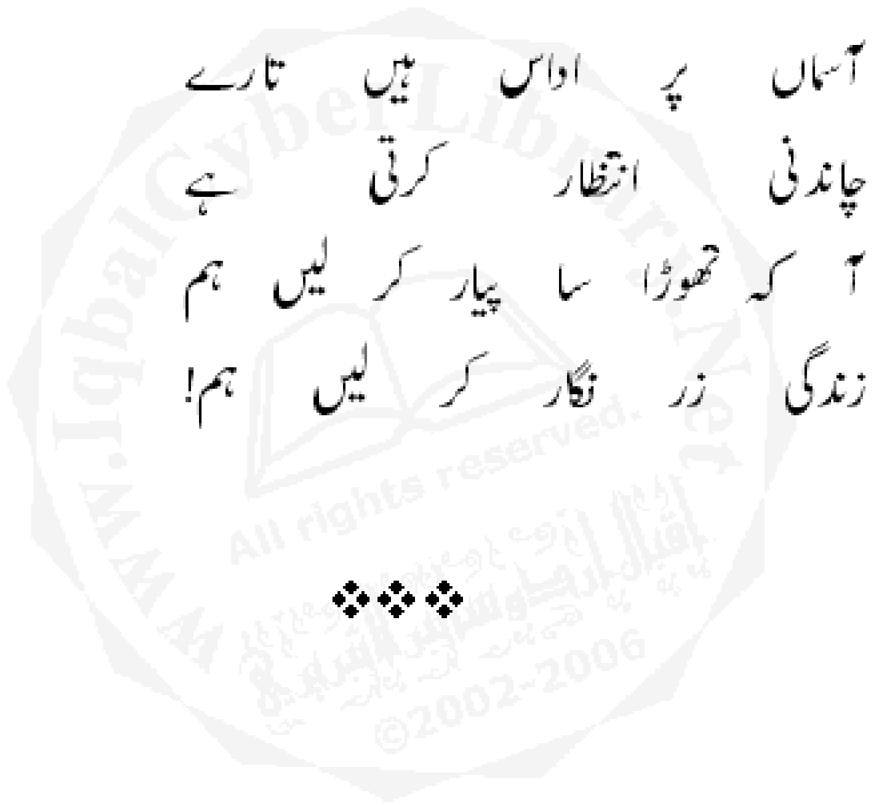
سرود شبانہ

گم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدہ نیاز میں ہے
حسن معصوم خواب ناز میں ہے

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفاں ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب
آ کہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم

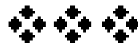
میری تنہائیوں پہ شام رہے؟
حسرت دید نا تمام رہے؟
دل میں بے تاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے



آسماں پر اداس ہیں تارے
چاندنی انتظار کرتی ہے
آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زر نگار کر لیں ہم!

❖❖❖

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے



❖

عشق منت کش قرار نہیں
حسن مجبور انتظار نہیں

تیری رنجش کی انتہا معلوم
حسرتوں کا مری شمار نہیں

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی
مے بہ اندازہ خمار نہیں

زیر لب ہے ابھی تبسم دوست
منتشر جلوۂ بہار نہیں

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

چارۂ انتظار کون کرے
تیری نفرت بھی استوار نہیں

فیض زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

❖❖❖



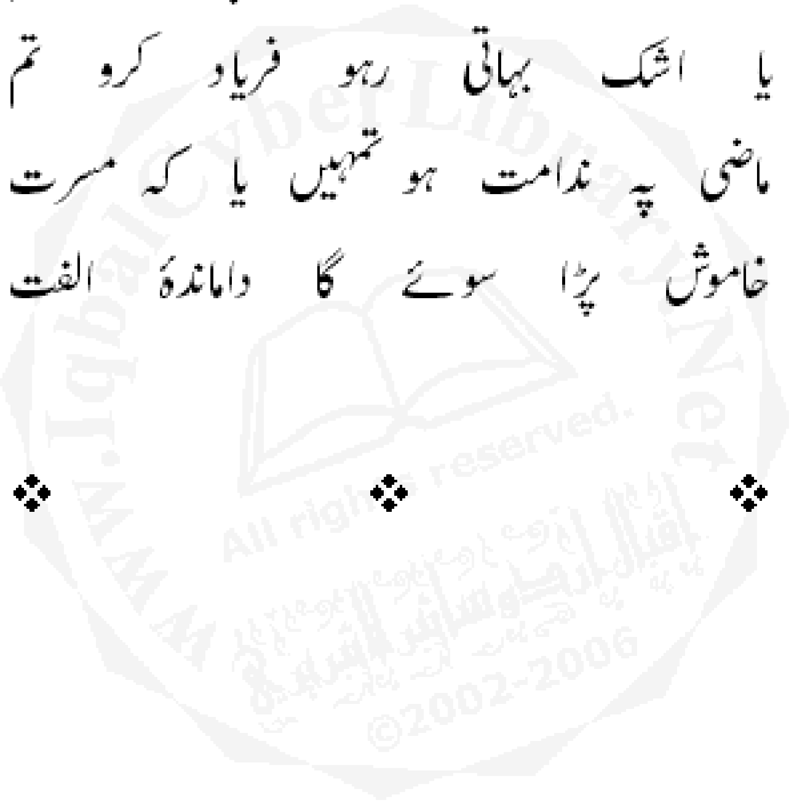
آخری خط

وہ وقت مری جان بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گزر جائے گا اندوہ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو مری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی

شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی
اپنے دل معصوم کو ناشاد کرو گی
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی
شاید مری بے سود وفاؤں پہ ہنسو گی
اس وضع کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہو گا
لیکن دل ناکام کو احساس نہ ہو گا

القصہ مآل غم الفت پہ ہنسو تم
یا اشک بہاتی رہو فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو تمھیں یا کہ مسرت
خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ الفت



❖ ❖ ❖



ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے

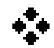
دل رہین نیاز ہو جائے
بے کسی کار ساز ہو جائے

منت چارہ ساز کون کرے؟
درد جب جاں نواز ہو جائے

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

لطف کا انتظار کرتا ہوں
جور تاحد ناز ہو جائے

عمر بے سود کٹ رہی ہے فیض
کاش افشائے راز ہو جائے

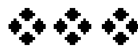
  

حسینہ خیال سے!

مجھے دے دے

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں!
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے!
ہمیشہ کے لیے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں
ضیائے حسن سے ظلمات دنیا میں نہ پھر آؤں
گزشتہ حسرتوں کے داغ میرے دل سے دھل جائیں
میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں
مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں
مجھے وہ اک نظر، اک جاودانی سی نظر دے دے

(براؤننگ)



مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو
ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے
ترے جلووں سے بزم زندگی جنت بدامن ہے
مری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک تار نفس میں آرزو بیدار ہے اب بھی
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نگاہیں بچھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی
مگر جان حزیں صدمے سہے گی آخرش کب تک؟
تری بے مہریوں پر جان دے گی آخرش کب تک؟
تری آواز میں سوئی ہوئی شیرینیاں آخر
مرے دل کی فسردہ خلوتوں میں جا نہ پائیں گی
یہ اشکوں کی فراوانی سے دھندلائی ہوئی آنکھیں
تری رعنائیوں کی تمکنت کو بھول جائیں گی
پکاریں گے تجھے تو لب کوئی لذت نہ پائیں گے
گلو میں تیری الفت کے ترانے سوکھ جائیں گے
مبادا یاد ہائے عہد ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موج ہائے غم میں کھو جائیں
مرے دل کی تہوں سے تیری صورت دھل کے بہہ جائے

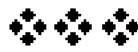
حریم عشق کی شمع درخشاں بجھ کے رہ جائے
مبادا اجنبی دنیا کی ظلمت گھیر لے تجھ کو!
مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

❖ ❖ ❖



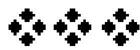
بعد از وقت

دل کو احساس سے دو چار نہ کر دینا تھا
ساز خوابیدہ کو بیدار نہ کر دینا تھا
اپنے معصوم تبسم کی فراوانی کو
وسعت دید پہ گلبار نہ کر دینا تھا
شوق مجبور کو بس ایک جھلک دکھلا کر
واقف لذت تکرار نہ کر دینا تھا
چشم مشتاق کی خاموش تمناؤں کو
یک بیک مائل گفتار نہ کر دینا تھا
جلوۂ حسن کو مستور ہی رہنے دیتے
حسرت دل کو گنہگار نہ کر دینا تھا



سرود شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفل ہست و بود ویراں ہے
پیکر التجا ہے خاموشی
بزم انجم فسردہ ساماں ہے
آبشار سکوت جاری ہے
چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزو خواب ہے گویا
ساری دنیا سراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر!
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز
ساز دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمار کیف آگیں
آرزو، خواب، تیرا روئے حسیں



اشعار

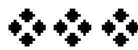
وہ عہدِ غم کی کاہشائے بے حاصل کو کیا سمجھے
جو ان کی مختصر روداد بھی صبر آزما سمجھے

یہاں وابستگی، واں برہمی، کیا جانیے کیوں ہے؟
نہ ہم اپنی نظر سمجھے نہ ہم ان کی ادا سمجھے

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

تمہاری ہر نظر سے منسلک ہے رشتۂ ہستی
مگر یہ دور کی باتیں کوئی نادان کیا سمجھے

نہ پوچھو عہد الفت کی، بس اک خواب پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پر لائے نہ دل کا مدعا سمجھے

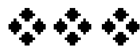


قطعات

وقف حرماں و یاس رہتا ہے
دل ہے، اکثر اداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

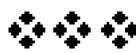
❖❖❖

فضائے دل پہ اداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے
فریب زیست سے قدرت کا مدعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے



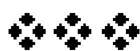
انتظار

گزر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آتیں
ریاضِ زیست ہے آزردۂ بہار ابھی
مرے خیال کی دنیا ہے سوگوار ابھی
جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اداس آنکھیں تری دید کو ترستی ہیں
بہارِ حسن پہ پابندیِ جفا کب تک؟
یہ آزمائشِ صبرِ گریز پا کب تک؟
قسم تمہاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویٰ صبر و شکیب، آ جاؤ
قرارِ خاطرِ بیتاب، تھک گیا ہوں میں



تہ نجوم

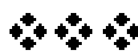
تہ نجوم، کہیں چاند نی کے دامن میں
ہجوم شوق سے اک دل ہے بے قرار ابھی
خمار خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں
چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بن موسے
رواں ہو برگ گل تر سے جیسے سیل شمیم
ضیائے دمہ میں دمکتا ہے رنگ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اڑا رہی ہے نسیم
دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگ نیاز پیدا ہے
اداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں
دل حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں
تہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں
کسی کا حسن ہے مصروف انتظار ابھی
کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں
ہے ایک گل کہ ہے ناواقف بہار ابھی



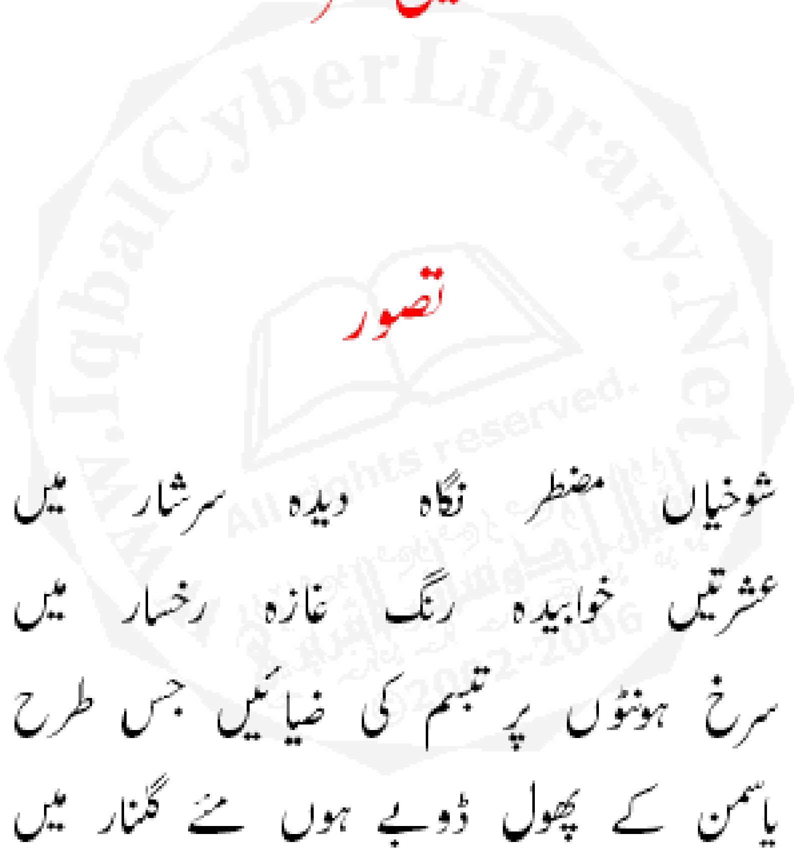
حسن اور موت

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو
فروغ نور ہو جس سے فضائے رنگیں میں
خزاں کے جور و ستم کو نہ جس نے دیکھا ہو
بہار نے جسے خون جگر سے پالا ہو
وہ ایک پھول سماتا ہے چشم گلچیں میں

ہزار پھولوں سے آباد باغ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے
کئی دلوں کی امیدوں کا جو سہارا ہو
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو
جہاں میں آکے ابھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو
نہ قحط عیش و مسرت، نہ غم کی ارزانی
کنار رحمت حق میں اسے سلاتی ہے
سکوت شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی
طواف کرنے کو صبح بہار آتی ہے
صبا چڑھانے کو جنت کے پھول لاتی ہے



تین منظر



تصور

شوخیاں مضطر نگاہ دیدہ سرشار میں
عشرتیں خوابیدہ رنگ غازہ رخسار میں
سرخ ہونٹوں پر تبسم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مئے گلنار میں

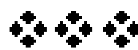
سامنا

چھنتی ہوئی نظروں سے جذبات کی دنیائیں
بے خوابیاں، افسانے، مہتاب، تمنائیں
کچھ الجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے
کچھ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ چھلک جائیں

❖❖❖

رخصت

فسردہ رخ، لبوں پر اک نیاز آمیز خاموشی
تبسم مضمحل تھا، مرمریں ہاتھوں میں لرزش تھی
وہ کیسی بے کسی تھی تیری پر تمکیں نگاہوں میں
وہ کیا دکھ تھا تری سہمی ہوئی خاموش آہوں میں



سرود

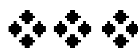
موت اپنی، نہ عمل اپنا، نہ جینا اپنا
کھو گیا شورش گیتی میں قرینہ اپنا

ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کام نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا

عرصۂ دہر کے ہنگامے تہ خواب سہی
گرم رکھ آتش پیکار سے سینہ اپنا

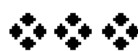
ساقیا رنج نہ کر جاگ اٹھے گی محفل
اور کچھ دیر اٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا

بیش قیمت ہیں یہ غم ہائے محبت، مت بھول
ظلمت یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا



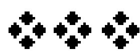
یاس

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل!
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم
زحمتِ گریہ و بکا بے سود
شکوۂ بختِ نارسا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول
بے نیازِ دعا ہے ربِّ کریم
بجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ الفت نباہنے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دے



آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
اور کل کی خبر کسے معلوم؟
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود
ہو نہ ہو اب سحر، کسے معلوم؟
زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
اب نہ دہرا فسانہ ہائے الم
اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکرِ فردا اتار دے دل سے
عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں، مت پوچھ
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ





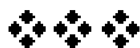
ہمت التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی

اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

اپنی مشق ستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یا وفا نہیں باقی

تیری چشم الم نواز کی خیر
دل میں کوئی گلہ نہیں باقی

ہو چکا ختم عہد ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی



ایک رہگزر پر

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرتیں پنہاں
وہ حسن جس کی تمنا میں جنتیں پنہاں
ہزار فتنے تہ پائے ناز، خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمار شباب سے رنگیں
شباب، جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں
وقار، جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں
ادائے لغزش پا پر قیامتیں قرباں
بیاض رخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں
سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راستوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم
وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبان شعر کو تعریف کرتے شرم آئے
وہ ہونٹ، فیض سے جن کے بہار لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش
گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سرو سہی نماز کرے
غرض وہ حسن جو محتاج وصف و نام نہیں
وہ حسن جس کا تصور بشر کا کام نہیں

کسی زمانے میں اس رہگزر سے گزرا تھا

بصد غرور و تجمل، ادھر سے گزرا تھا

اور اب یہ راہگزر بھی ہے دلفریب و حسیں

ہے اس کی خاک میں کیف شراب وشعر مکیں

ہوا میں شوخی رفتار کی ادائیں ہیں

فضا میں نرمی گفتار کی صدائیں ہیں

غرض وہ حسن اب اس رہ کا جزو منظر ہے

نیاز عشق کو اک سجدہ گہ میسر ہے

❖❖❖



چشم میگوں ذرا ادھر کر دے
دست قدرت کو بے اثر کر دے

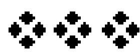
تیز ہے آج درد دل ساقی
تلخی مے کو تیز تر کر دے

جوش وحشت ہے تشنہ کام ابھی
چاک دامن کو تا جگر کر دے

میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے

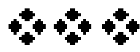
لٹ رہی ہے مری متاع نیاز
کاش وہ اس طرف نظر کر دے

فیض تکمیل آرزو معلوم!
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے



ایک منظر

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور
آسمانوں سے جوئے درد رواں
چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لے رباب ہستی کی
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کاں

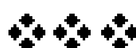


میرے ندیم

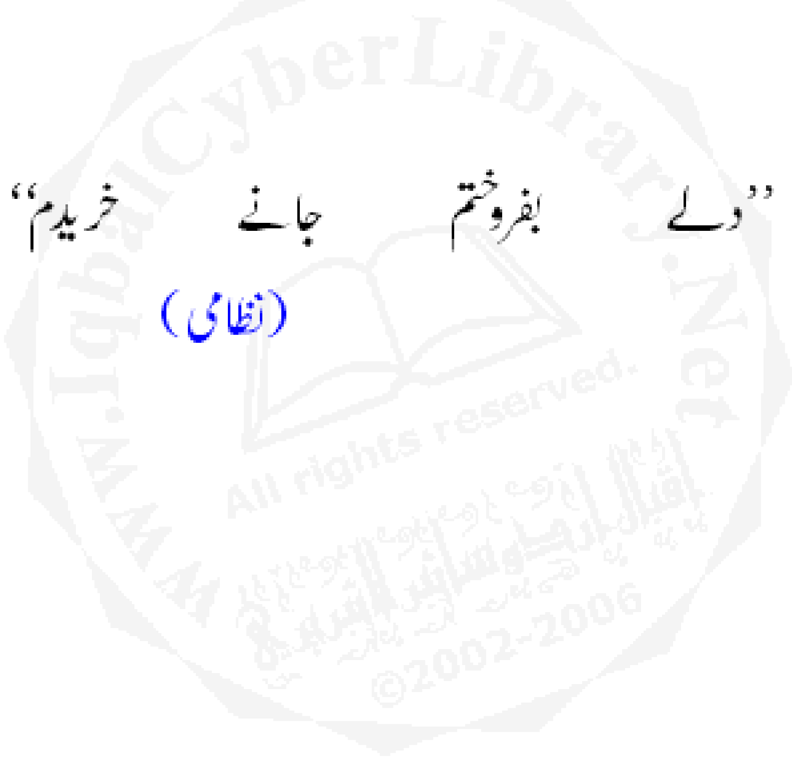
خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنون عشق کی ہمت جوان تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم؟

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظر راہیں
وہ پاس ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں
وہ انتظار کی راتیں، طویل تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں، وہ مخملیں بانہیں
کہانیاں تھیں، کہیں کھو گئی ہیں، میرے ندیم

مچل رہا ہے رگ زندگی میں خون بہار
الجھ رہے ہیں پرانے غموں سے روح کے تار
چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیار حبیب
ہیں انتظار میں اگلی محبتوں کے مزار
محبتیں جو فنا ہو گئی ہیں میرے ندیم!







''دلے بفروختم جانے خریدم''

(نظامی)

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے۔
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں میں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے

لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجئے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجئے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

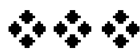
دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصت گناہ ملی، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دل ناکردہ کار کے



سوچ

کیوں میرا دل شاد نہیں ہے
کیوں خاموش رہا کرتا ہوں
چھوڑو میری رام کہانی
میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

میرا دل غمگیں ہے تو کیا
غمگیں یہ دنیا ہے ساری
یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تو گر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

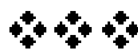
غم ہر حالت میں مہلک ہے
اپنا ہو یا اور کسی کا
رونا دھونا، جی کو جلانا

یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں
بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں

بے فکرے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے، خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے
ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا



❖

وفائے وعدہٗ نہیں، وعدہٗ دگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے، لیکن اس قدر بھی نہیں

برس رہی ہے حریم ہوس میں دولت حسن
گدائے عشق کے کاسے میں اک نظر بھی نہیں

نہ جانے کس لیے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

نگاہ شوق سر بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی، اتنے بے خبر بھی نہیں

یہ عہد ترک محبت ہے، کس لیے آخر
سکون قلب ادھر بھی نہیں ادھر بھی نہیں

رقیب سے!

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی الفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ رہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اسی رعنائی کے
جن کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں اس کے ملبوس
کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں

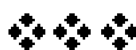
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رخ زرد کے معنی سیکھے

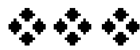
جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

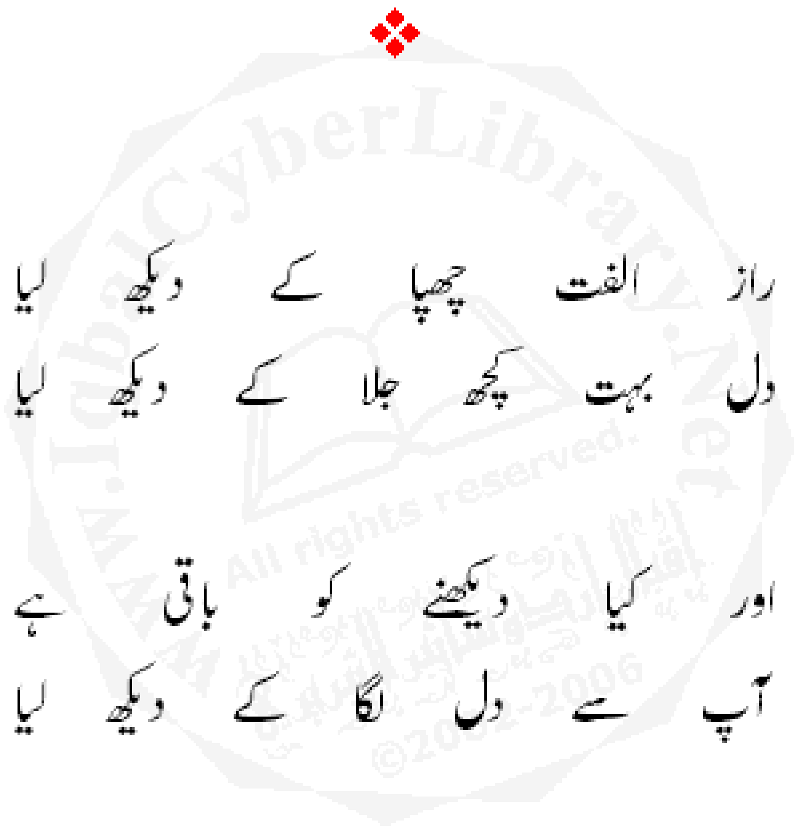
جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے



تنہائی

پھر کوئی آیا دل زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگوار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا





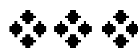
راز الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

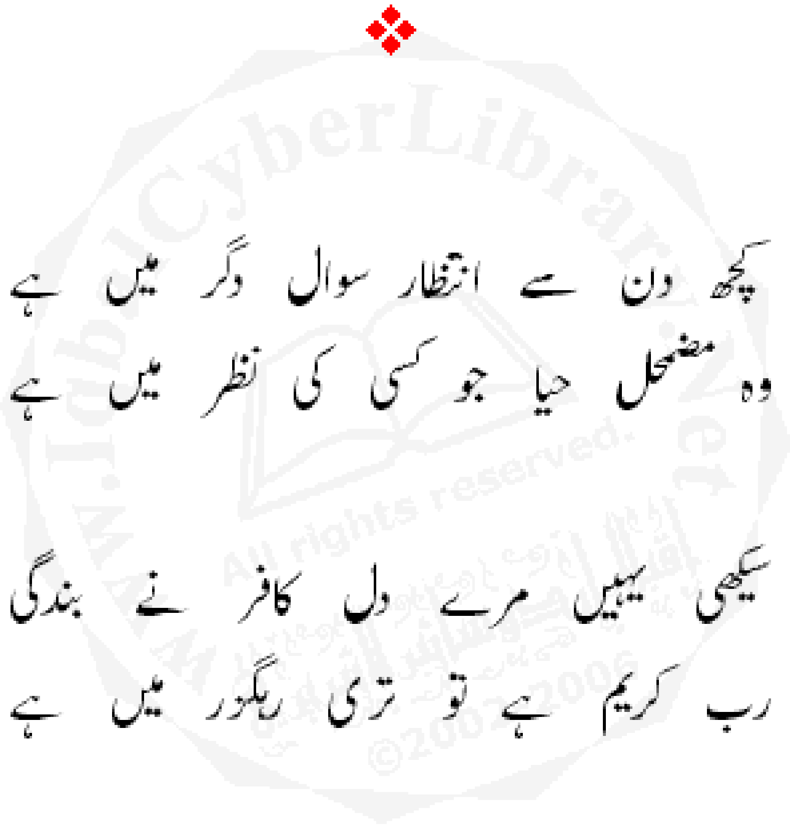
اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

فیض تکمیل غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا



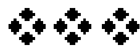


کچھ دن سے انتظار سوال دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

سیکھی یہیں مرے دل کافر نے بندگی
رب کریم ہے تو تری رہگذر میں ہے

ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصور شام و سحر میں ہے

کیا جانے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب
وہ غم جو میرے دل میں ہے تیری نظر میں ہے





پھر حریف بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے

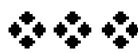
تھی، مگر اتنی رائگاں بھی نہ تھی
آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے

تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے

ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

نہ گئی تیری بے رخی نہ گئی
ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

فیض ہوتا رہے جو ہونا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے



چند روز اور مری جان!

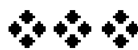
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی معیاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں
عرصہ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے
یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار
چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہوا درد

دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار
چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

❖❖❖

مرگ سوز محبت

آؤ کہ مرگ سوز محبت منائیں ہم
آؤ کہ حسن ماہ سے دل کو جلائیں ہم
خوش ہوں فراق قامت و رخسار یار سے
سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم
ویرانیِ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم
پھر اوٹ لے کے دامن ابر بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم
سلجھائیں بے دلی سے یہ الجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم
پھر دل کو پاس ضبط کی تلقین کر چکیں
اور امتحان ضبط سے پھر جی چرائیں ہم
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستان عشق
اب ختم عاشقی کے فسانے سنائیں ہم



کتے

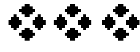
یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوق گدائی
زمانے کی پھٹکار سرمایہ ان کا
جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

نہ آرام شب کو، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا د
و

یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے

کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے



بول

بول، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے

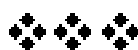
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے

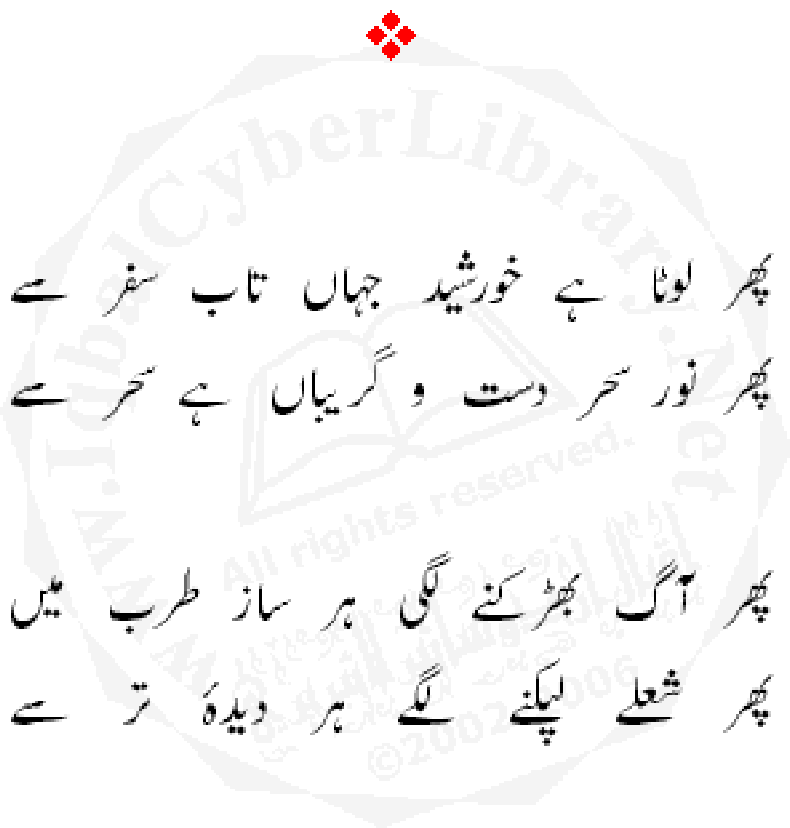
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے، سرخ ہے آہن

کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے

بول کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے!





پھر لوٹا ہے خورشید جہاں تاب سفر سے
پھر نور سحر دست و گریباں ہے سحر سے

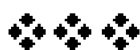
پھر آگ بھڑکنے لگی ہر ساز طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے

پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہگزر سے

وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوار قفس حد نظر سے

ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے



اقبال

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گزر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا

اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں

چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں

اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز

یہ گیت مثل شعلہ جوالہ تند و تیز
اس کی لپک سے باد فنا کا جگر گداز

جیسے چراغ وحشت صرصر سے بے خطر
یا شمع بزم صبح کی آمد سے بے خبر

❖❖❖

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسن دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

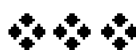
کئی بار اس کی خاطر ذرے ذرے کا جگر چیرا
مگر یہ چشم حیراں، جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاع لعل و گوہر کی گراں یابی
متاع غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشم تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سر خسرو سے ناز کجکلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے؟
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی



موضوعِ سخن

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے
ہات

ان کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنیٰ ہے یہی

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے؟

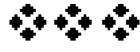
ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا!
کس لیے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کم بخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں

طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور انہیں



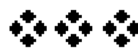


ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے گل شدہ شمعوں کی قطار
نور خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حسن محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

غایت سود و زیاں، صورت آغاز و مآل
وہی بے سود تجسس، وہی بے کار سوال
مضمحل ساعت امروز کی بے رنگی سے
یاد ماضی سے غمیں، دہشت فردا سے نڈھال

تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں
اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک الجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوش، چاک گریباں کی تلاش



شاہراہ

ایک افسردہ شاہرہ ہے دراز
دور افق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹی پہ اپنے سینے کے
سرمگیں حسن کو بچھائے ہوئے

جس طرح کوئی غمزدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محو خیال
وصل محبوب کے تصور میں
مو بمو چور، عضو عضو نڈھال





نصیب آزمانے کے دن آ رہے ہیں
قریب ان کے آنے کے دن آ رہے ہیں

جو دل سے کہا ہے، جو دل سے سنا ہے
سب ان کو سنانے کے دن آ رہے ہیں

ابھی سے دل و جاں سر راہ رکھ دو
کہ لٹنے لٹانے کے دن آ رہے ہیں

ٹپکنے لگی ان نگاہوں سے مستی
نگاہیں چرانے کے دن آ رہے ہیں

صبا پھر ہمیں پوچھتی پھر رہی ہے
چمن کو سجانے کے دن آ رہے ہیں

چلو فیض پھر سے کہیں دل لگائیں

سنا ہے ٹھکانے کے دن آ رہے ہیں



انتہا

دست صبا



کلثوم، کے نام

ابتدائیہ

ایک زمانہ ہوا جب غالب نے لکھا تھا کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی دیدۂ بینا نہیں بچوں کا کھیل ہے۔ اگر غالب ہمارے ہمعصر ہوتے تو غالباً کوئی نہ کوئی ناقد ضرور پکار اٹھتا کہ غالب نے بچوں کے کھیل کی توہین کی ہے، یا یہ کہ غالب ادب میں پروپیگنڈے کے حامی معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر کی آنکھ کو قطرے میں دجلہ دیکھنے کی تلقین کرنا صریح پروپیگنڈہ ہے۔ اس کی آنکھ کو تو محض حسن سے غرض ہے اور حسن اگر قطرے میں دکھائی دے جائے تو وہ قطرہ دجلہ کا ہو یا گلی کی بدرو کا، شاعر کو اس سے کیا سروکار، یہ دجلہ دیکھنا دکھانا حکیم، فلسفی یا سیاست دان کا کام ہوگا شاعر کا کام نہیں ہے۔

اگر ان حضرات کا کہنا صحیح ہوتا تو آبروئے شیوۂ اہل ہنر رہتی یا جاتی، اہل ہنر کا کام یقیناً بہت سہل ہو جاتا لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے فن سخن (یا کوئی اور فن) بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کے لیے تو غالب کا دیدۂ بینا بھی کافی نہیں، اس لیے کافی نہیں کہ شاعر یا ادیب کو قطرے میں دجلہ دیکھنا ہی نہیں دکھانا بھی ہوتا ہے۔ مزید برآں اگر غالب کے دجلہ سے زندگی اور موجودات کا نظام مراد لیا جائے تو ادیب خود بھی اسی دجلہ کا ایک قطرہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے ان گنت قطروں سے مل کر اس دریا کے رخ، اس کے بہاؤ، اس کی ہیبت اور اس کی منزل کے تعین کی ذمہ داری بھی ادیب کے سر آن پڑتی ہے۔

یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گردو پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے

دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں داخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔

اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔

نظامِ زندگی کسی حوض کا ٹھہرا ہوا، سنگ بستہ، مقید پانی نہیں ہے جسے تماشائی کی ایک غلط انداز نگاہ احاطہ کر سکے۔ دور دراز اوجھل دشوار گزار پہاڑیوں میں برفیں پگھلتی ہیں، چشمے ابلتے ہیں، ندی نالے پتھروں کو چیر کر، چٹانوں کو کاٹ کر آپس میں ہم کنار ہوتے ہیں اور پھر یہ پانی کتنا بڑھتا، وادیوں، جنگلوں اور میدانوں میں سمٹتا اور پھیلتا جاتا ہے۔ جس دیدۂ بینا نے انسانی تاریخ میں زندگی کے یہ نقوش و مراحل نہیں دیکھے اس نے دجلہ کا کیا دیکھا ہے۔ پھر شاعر کی نگاہ ان کا گزشتہ اور حالیہ مقامات تک پہنچ بھی گئی، لیکن ان کی منظر کشی میں نطق ولب نے یاوری نہ کی یا اگلی منزل تک پہنچنے کے لیے جسم وجاں جہد وطلب پر راضی نہ ہوئے تو بھی شاعر اپنے فن سے پوری طرح سرخرو نہیں ہے۔

غالباً اس طویل و عریض استعارے کو روزمرہ الفاظ میں بیان کرنا غیر ضروری ہے۔ مجھے کہنا صرف یہ تھا کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک، اور اس جدوجہد میں حسب توفیق شرکت، زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔

فن اسی زندگی کا ایک جزو اور فنی جدوجہد اسی جدوجہد کا ایک پہلو ہے۔ یہ تقاضا ہمیشہ قائم رہتا ہے اس لیے طالب فن کے مجاہدے کا کوئی نروان نہیں۔ اس کا فن ایک دائمی کوشش ہے اور مستقل کاوش۔

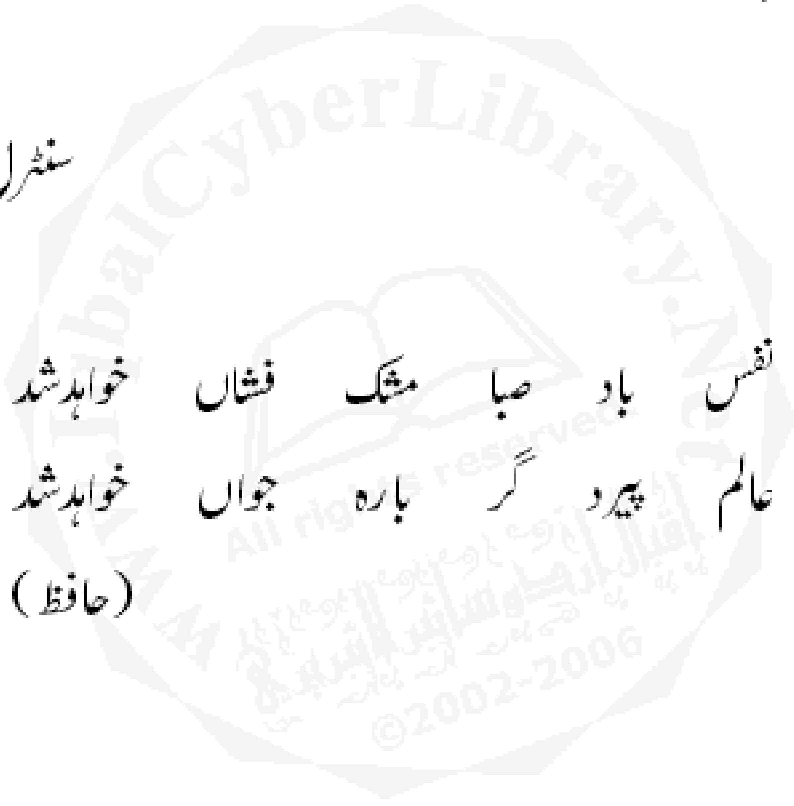
اس کوشش میں کامرانی یا ناکامی تو اپنی اپنی توفیق و استطاعت پر ہے۔ لیکن کوشش میں مصروف رہنا بہر طور ممکن بھی ہے اور لازم بھی۔

یہ چند صفحات بھی اسی نوع کی ایک کوشش ہیں۔ ممکن ہے کہ فن کی عظیم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کے مظاہرے میں بھی نمائش یا تعلّی اور خود

پسندی کا ایک پہلو نکلتا ہو، لیکن کوشش کیسی بھی حقیر کیوں نہ ہو، زندگی یا فن سے فرار اور شرمساری پر فائق ہے۔

فیض

سنٹرل جیل حیدر آباد



نفس باد صبا مشک فشاں خواہد شد
عالم پیر دگر بارہ جواں خواہد شد
(حافظ)

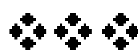
❖

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہء زنجیر میں زباں میں نے



اے دل بے تاب ٹھہر!

تیرگی ہے کہ امڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبض ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہو اور بھی بہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسار سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دل بیتاب ٹھہر
ابھی زنجیر چھنکتی ہے پس پردہ ساز
مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغر ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں
لغزش پا میں ہے پابندی آداب ابھی
اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو
اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو
جلد یہ سطوت اسباب بھی اٹھ جائے گی
یہ گرانباریء آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے





کبھی کبھی یاد میں ابھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی، وہ قربتیں سی، وہ فاصلے سے

کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں، آ کے رکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی، وہ سارے عنوان وصال کے سے

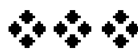
نگاہ و دل کو قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی
وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے الفت نئے سرے سے

بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا، کہیں سبک تر، کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے

تمھیں کہو رند و محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا
یہ آ کے بیٹھے ہیں میکدے میں وہ اٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

سیاسی لیڈر کے نام

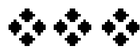
سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرم ستیز
جس طرح تیتری کہسار پہ یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور سے اک جال سا بن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ، تری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس، یہی ہاتھ تو ہیں
تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت، لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے!



مرے ہمدمے، مرے دوست

گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم مرے دوست
گر مجھے اس کا یقین ہو کہ ترے دل کی تھکن
تیری آنکھوں کی اداسی، ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی
گر مرا حرف تسلی وہ دوا ہو جس سے
جی اٹھے پھر ترا اجڑا ہوا بے نور دماغ
تیری پیشانی سے دھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے
گر مجھے اس کا یقیں ہو مرے ہمدم مرے دوست
روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سناتا رہوں ہلکے، شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمد صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں

کس طرح عارضِ محبوب کا شفاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے
کیسے گلچیں کے لیے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب
کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے
یونہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تیری خاطر
گیت بنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر
پر مرے گیت ترے دکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جراح نہیں، مونس و غم خوار سہی
گیت نشتر تو نہیں، مرہمِ آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نشتر کے سوا
اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سوا، تیرے سوا، تیرے سوا



صبح آزادی

اگست ء

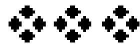
یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں، جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہو گا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل

جواں لہو کی پر اسرار شاہراہوں سے
چلے جا یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیار حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینان نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراق ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصال منزل و گام

بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور
نشاط وصل حلال و عذاب ہجر حرام
جگر کی آگ، نظر کی امنگ، دل کی جلن
کی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگار صبا، کدھر کو گئی

ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر نہیں
ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدۂ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی



لوح و قلم

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے، رقم کرتے رہیں گے

اسباب غم عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانی دوراں پہ کرم کرتے ہیں گے

ہاں تلخیء ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم، مشق ستم کرتے ہیں گے

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے ہیں گے

مے خانہ سلامت ہے، تو ہم سرخی مے سے
تزئین در و بام حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے

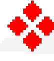
اک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

❖❖❖



نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، تیرے بازو، ترا کنار نہیں





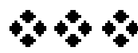
صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی
ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں
وہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں



شورشِ بربط و نے

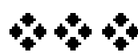
پہلی آواز

اب سعی کا امکاں اور نہیں پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے، مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لیے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجیے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجیے
شیرینیِ لب، خوشبوئے دہن اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابیِ دل، تفریحِ نظر، اب زیست کا درماں کوئی نہیں
جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نپٹا لیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری لحد ہے



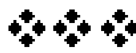
دوسری آواز

ہستی کی متاع بے پایاں، جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعل دل، بسمل ہے تو کیا، رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایام ترے، بدلا نہیں مسلک شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسم گل کے قدم، قائم ہے جمال شمس و قمر
آباد ہے وادی کاکل و لب، شاداب و حسیں گلگشت نظر
مقسم ہے لذت درد جگر، موجود ہے نعمت دیدہ تر
اس دیدہ تر کا شکر کرو، اس ذوق نظر کا شکر کرو
اس شام و سحر کا شکر کرو، ان شمس و قمر کا شکر کرو



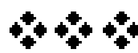
پہلی آواز

گر ہے یہی مسلک شمس و قمر، ان شمس و قمر کا کیا ہو گا
رعنائی شب کا کیا ہوگا، انداز سحر کا کیا ہوگا
جب خون جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہو گا، اس ذوق نظر کا کیا ہوگا
جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے، نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اس کلک گہر کا کیا ہوگا
جب کنج قفس مسکن ٹھہرا، اور جیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسم گل، اس درد جگر کا کیا ہو گا



دوسری آواز

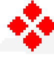
یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک
اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورش بربط و نے
وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامہ طبل قیصر و کے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل بھر پور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لوح و قلم، یہ طبل و علم، یہ مال و حشم سب اپنے ہیں



دامنِ یوسف

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر، وضعِ تکلف تو دیکھیے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھیے!

❖❖❖



پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوان ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرم وفا دیکھیے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطا کار سردار کھڑے ہیں



طوق و دار کا موسم

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم، بہار کا موسم

گراں ہے دل پہ غم روزگار کا موسم
ہے آزمائش حسن نگار کا موسم

خوشا نظارۂ رخسار یار کی ساعت
خوشا قرار دل بے قرار کا موسم

حدیث بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرام ابر سر کوہسار کا موسم

نصیب صحبت یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقص سایہ سرو و چنار کا موسم

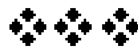
یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجران یار کا موسم

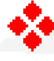
یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر، یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم





ترا جمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی



مستقل

(قوالی)

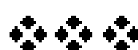
کہاں ہے منزل راہ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی، یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے

ٹھہر اے دل، جمال روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے
ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوش صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا، ہم بھی دیکھیں گے

صلا آ تو چکے محفل میں اس کوئے ملامت سے
کسے روکے گا شور پند بے جا، ہم بھی دیکھیں گے
کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا، ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکر اغیار و اعدا، ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سر مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اجالا، ہم بھی دیکھیں گے
جو فرق صبح پر چمکے گا تارا، ہم بھی دیکھیں گے





تم آئے ہو، نہ شب انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

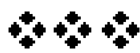
جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارت گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے





تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

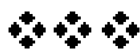
حدیث یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکر وطن
تو چشم صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اترنے لگتے ہیں



ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سی باقی ہے گل دامنی و کج کلہی



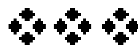
❖

شفق کی راہ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شب فراق کے گیسو فضا میں لہرائے

کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلہ روز و شام ٹھہرائے

یہ ضد ہے یاد حریفان بادہ پیما کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے، نہ دن کو ابر آئے

صبا نے پھر در زنداں پہ آ کے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

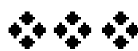


تمہارے حسن کے نام

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام

بکھر گیا جو کبھی رنگ پیرہن سر بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام
کہیں جو قامت زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساط غزل جب ڈبو لیے دل نے
تمہارے سایہ رخسار و لب میں ساغر و جام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام!

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابش حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداری عروس سخن
تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخی ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام!



ترانہ

دربار وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے

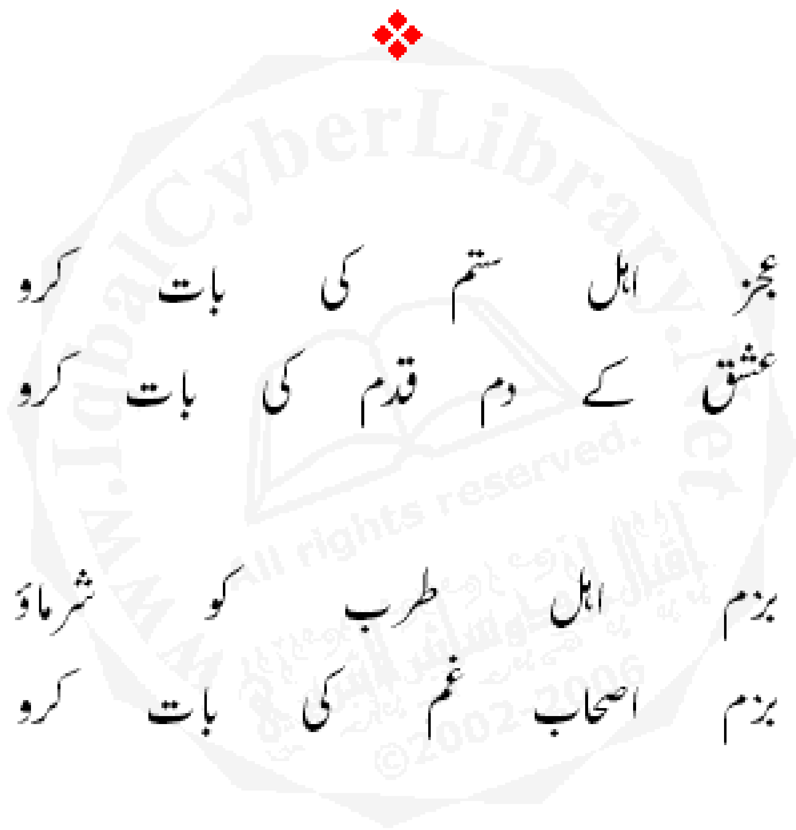
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو، کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے



❖



عجز اہل ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

بزم اہل طرب کو شرماؤ
بزم اصحاب غم کی بات کرو

بزم ثروت کے خوش نشینوں سے
عظمت چشم نم کی بات کرو

ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی
تم ستم یا کرم کی بات کرو

خیر، میں اہل دیر جیسے ہیں
آپ اہل حرم کی بات کرو

ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی
روز وصل صنم کی بات کرو

جان جائیں گے جاننے والے

فیض، فرہاد و جم کی بات کرو

❖❖❖



(نذر سودا)

فکر دلداری گلزار کروں یا نہ کروں
ذکر مرغان گرفتار کروں یا نہ کروں

قصہ سازش اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوہ یار طرحدار کروں یا نہ کروں

جانے کیا وضع ہے اب رسم وفا کی اے دل
وضع دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہل ہوس
مدح زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

یوں بہار آئی ہے امسال کے گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

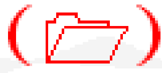
گویا اس سوچ میں ہے دل میں لہو بھر کے گلاب
دامن و جیب کو گلنار کروں یا نہ کروں

ہے فقط مرغ غزل خواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمی گفتار کروں یا نہ کروں

❖❖❖

دو عشق





تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیِ گلفام
وہ عکسِ رخِ یار سے لہکے ہوئے ایام
وہ پھول سی کھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا امید کا ہنگام

امید کہ لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مقدر

اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگِ حنا کی
اس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اس راہ پہ پھولے گی شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے

ہر صبح کی لو تیری سی سینے میں لگی ہے

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دل زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دست صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردن مہتاب میں باہیں

❖❖❖



چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائش منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

اس جان جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی، کبھی رو رو کے پکارا
پورے کیے سب حرف تمنا کے تقاضے
ہر درد کو اجیالا، ہر اک غم کو سنوارا

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریت جاں، راحت تن، صحت داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پس زنداں، کبھی رسوا سر بازار
گرجے ہیں بہت شیخ سر گوشہ منبر

کڑکے ہیں بہت اہل حکم بر سر دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوک دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرز ملامت
اس عشق، نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغ ندامت

❖❖❖

گرانی شب ہجراں دو چند کیا کرتے
علاج درد ترے درد مند کیا کرتے

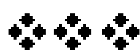
وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دست عدو کے گزند کیا کرتے

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کو بکو دلبر
انہیں پسند، انہیں نا پسند کیا کرتے

ہمیں نے روک لیا، پنجہ جنوں ورنہ
ہمیں اسیر یہ کوتہ کمند کیا کرتے

جنہیں خبر تھی کہ شرط نوا گری کیا ہے
وہ خوش نوا گلہ قید و بند کیا کرتے

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سر بلند، کیا کرتے!



وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

تم آ رہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

یہی کنار فلک کا سیہ تریں گوشہ
یہی ہے مطلع ماہ تمام کہتے ہیں

پیو کہ مفت لگا دی ہے خون دل کی کشید
گراں ہے اب کے مۓ لالہ فام کہتے ہیں

فقیہ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیان چمن
کھلے نہ پھول، اسے انتظام کہتے ہیں

کہو تو ہم بھی چلیں فیض، اب نہیں سردار
وہ فرق مرتبہ خاص و عام، کہتے ہیں

❖❖❖

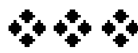


❖

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو، اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے، نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام



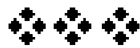
(ق)

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رو زلف بکھرانے کا نام
اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خم کا، پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے، غریبانِ چمن!
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

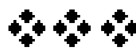
فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام



نوحہ

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مری عمر گزشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا مرا، اور مرا عہد شباب
اس کے بدلے مجھے تم دے گئے جاتے جاتے
اپنے غم کا یہ دمکتا ہوا خوں رنگ گلاب
کیا کروں بھائی، یہ اعزاز میں کیونکر پہنوں
مجھ سے لے لو مری سب چاک قمیصوں کا حساب
آخری بار ہے، لو مان لو اک یہ بھی سوال
آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوس جواب
آ کے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو مری عمر گزشتہ کی کتاب

جولائی ء



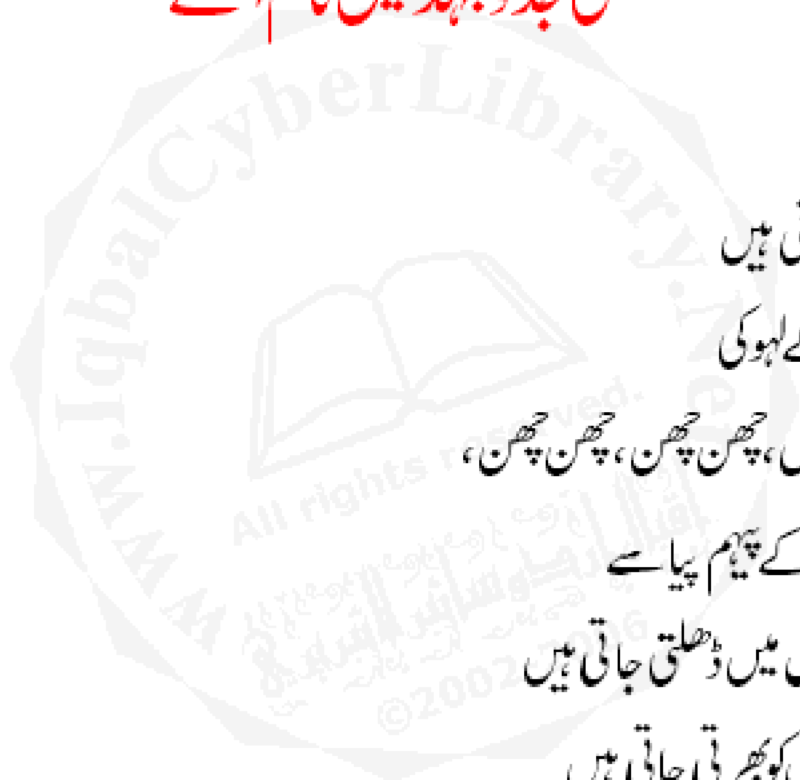
ایرانی طلبہ کے نام



جو امن اور آزادی



کی جدوجہد میں کام آئے



یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن،
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتھوں کی بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟

اے پوچھنے والے پردیسی!

یہ طفل و جواں

اس نور کے نورس موتی ہیں

اس آگ کی کچی کلیاں ہیں

جس میٹھے نور اور کڑوی آگ

سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا

صبح بغاوت کا گلشن

اور صبح ہوئی من من، تن تن،

ان جسموں کا چاندی سونا

ان چہروں کے نیلم، مرجاں،

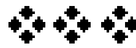
جگ مگ جگ مگ، رخشاں رخشاں،

جو دیکھنا چاہے پردیسی

پاس آئے دیکھے جی بھر کر

یہ زیست کی رانی کا جھومر

یہ امن کی دیوی کا کنگن!



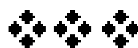
دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

رقص مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سوئے مے خانہ سفیران حرم آگے ہیں

کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

اور کچھ دیر نہ گزرے شب فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں



اگست ۱۹۵۲ء

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہ چمن میں غزلخواں ہوئے تو ہیں

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پر افشاں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم
اب بے نیاز گردش دوراں ہوئے تو ہیں

اہل قفس کی صبح چمن میں کھلے گی آنکھ
باد صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں

ہے دشت اب بھی دشت، مگر خونِ پا سے فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

❖❖❖



نثار میں تری گلیوں کے....

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظم بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

☆ سنگ ہا را بستند و سگاں را کشاوند (شیخ سعدی)

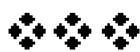
بہت ہے ظلم کے دست بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی

چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصور شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفت سایہ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی ہے، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالع رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردش لیل و نہار رکھتے ہیں



❖

اب وہی حرف جنوں سب کے زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمن دیں، راحت جاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سر کوئے بتاں ٹھہری ہے

ہے وہی عارض لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

بکھری اک بار تو ہاتھ آئی ہے کب موج شمیم
دل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں ٹھہری ہے

دست صیاد بھی عاجز ہے، کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری

آتے آتے یونہی دم بھر کو رکی ہو گی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

❖❖❖

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ در
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انہی ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغر دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اترا کرتی تھی
صہبائے غم جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں

مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
ان شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

ناداری، دفتر، بھوک اور غم
ان سپنوں سے ٹکراتے رہے
بے رحم تھا چومکھ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے

یا شاید ان ذروں میں کہیں
موتی ہے تمہاری عزت کا
وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا

اس مال کی دھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر، یاں مفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی

یہ ساغر، شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں
یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رلواتے ہیں

تم ناحق شیشے چن چن کر!
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ ادھیڑا، ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے؟

اس کار گہ ہستی میں جہاں
یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پر ہو سکتے ہیں

جو ہاتھ بڑھے، یاور ہے یہاں
جو آنکھ اٹھے، وہ بختاور

یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ، مگر

کب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

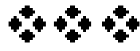
کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں
ہر پربت کو، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں

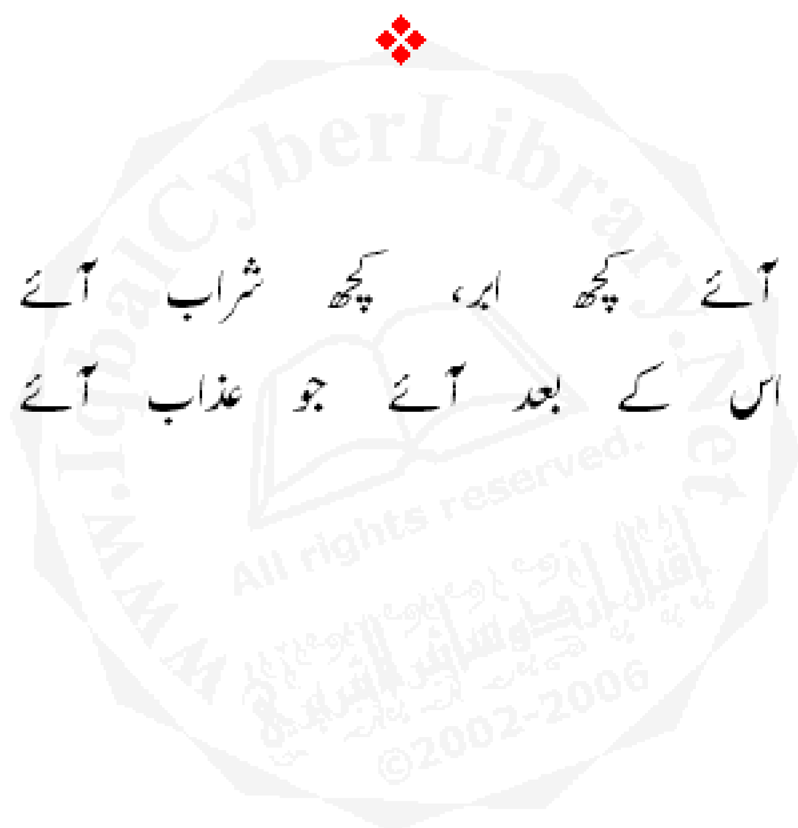
کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت لگاتے پھرتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے رہتے ہیں

سب ساغر، شیشے، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس رن سے بلاوے آتے ہیں





آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

ق

بام مینا سے ماہتاب اترے
دست ساقی میں آفتاب آئے
ہر رگ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

عمر کے ہر ورق پہ دل کو نظر
تیری مہر و وفا کے باب آئے

کر رہا تھا غم جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے
نہ گئی تیرے غم کی سرداری
دل میں یوں روز انقلاب آئے
جل اٹھے بزم غیر کے در و بام
جب بھی ہم خانماں خراب آئے

ق

اس طرح اپنی خامشی گونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے
فیض، تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے، کامیاب آئے

❖❖❖

نذرِ غالب

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں

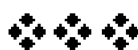
بہار آئے گی جب آئے گی، یہ شرط نہیں
کہ تشنہ کام رہیں گرچہ بادہ رکھتے ہیں

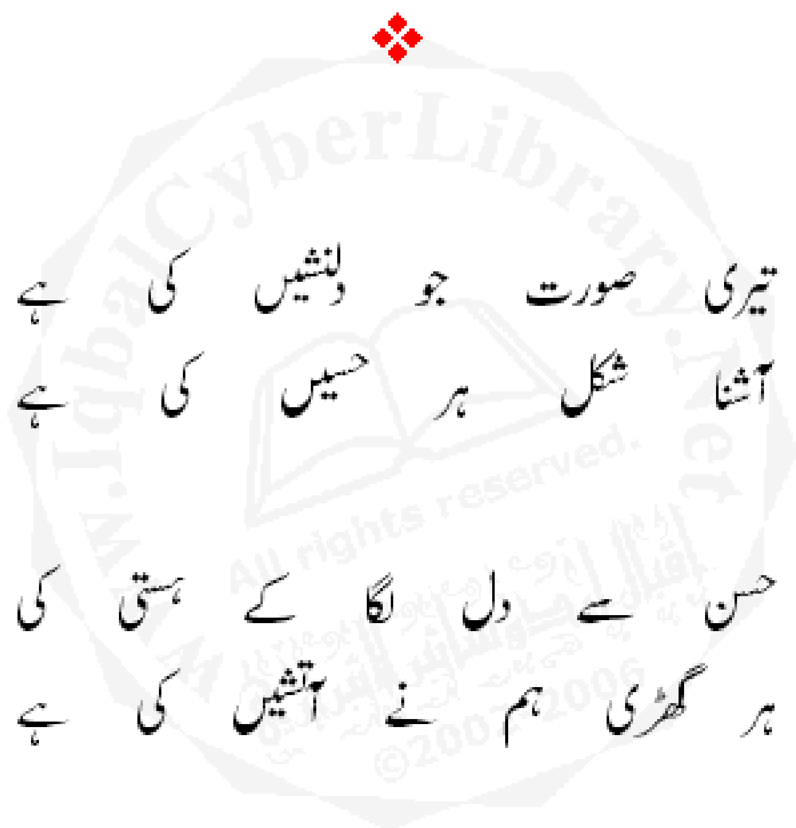
تری نظر کا گلہ کیا؟ جو ہے گلہ دل کا
تو ہم سے ہے، کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں

نہیں شراب سے رنگیں تو غرق خوں ہیں کہ ہم
خیالِ وضعِ قمیص و لبادہ رکھتے ہیں

غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

جوابِ واعظِ چابک زباں میں فیض ہمیں
یہی بہت ہیں جو دو حرفِ سادہ رکھتے ہیں





❖

تیری صورت جو دلنشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے

حسن سے دل لگا کے ہستی کی
ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے

صبح گل ہو کہ شام مے خانہ
مدح اس روئے نازنیں کی ہے

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے

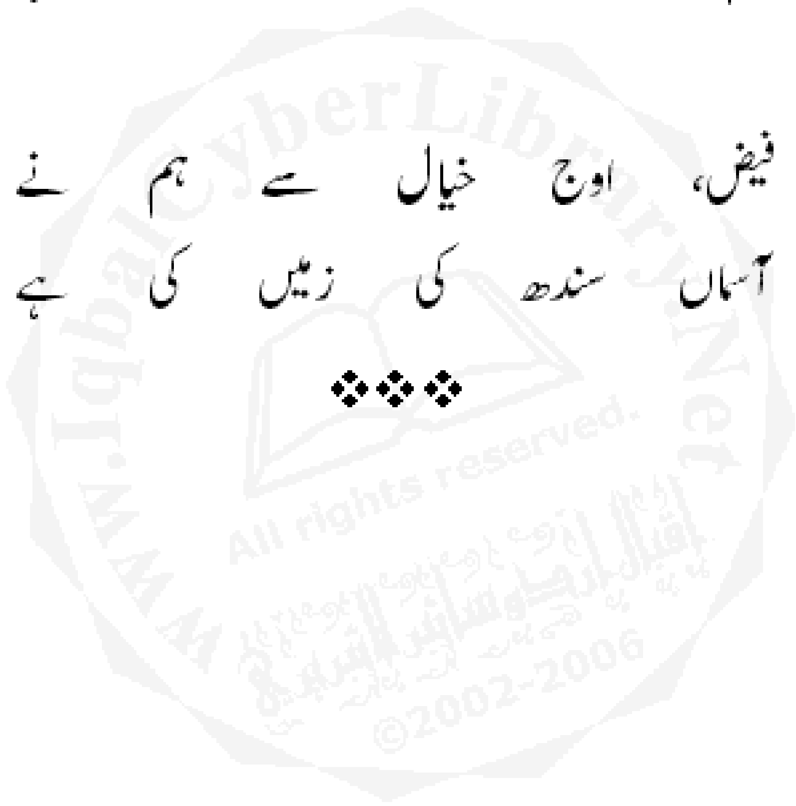
ذکر دوزخ، بیان حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

اشک تو کچھ بھی رنگ لا نہ سکے
خوں سے تر آج آستیں کی ہے

کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے

فیض، اوج خیال سے ہم نے
آسماں سندھ کی زمیں کی ہے

❖❖❖



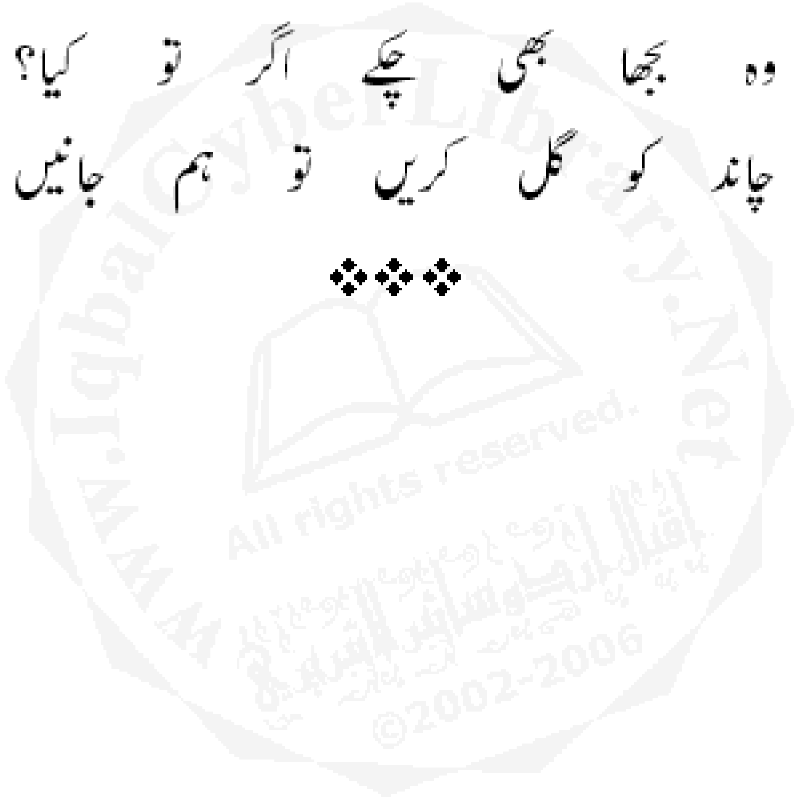
زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحن زنداں کے بے وطن اشجار
سنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامن آسماں پہ نقش و نگار
شانہ بام پر دمکتا ہے!
مہرباں چاندنی کا دست جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موج درد فراق یار آئے

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے

کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا؟
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

❖❖❖



زنداں کی ایک صبح

رات باقی تھی ابھی جب سر بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا جاگ سحر آئی ہے
جاگ اس شب جو مے خواب ترا حصہ تھی
جام کے لب سے تہ جام اتر آئی ہے
عکس جاناں کو وداع کر کے اٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر

جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

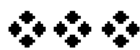
صحن زنداں فمیں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطح ظلمت سے دمکتے ہوئے ابھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد، فراق رخ محبوب کا غم

دور نوبت ہوئی، پھرنے لگے بیزار قدم

زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہل زنداں کے غضبناک، خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے

لذب خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چور صدائیں جاگیں
دور دروازہ کھلا کوئی، کوئی بند ہوا
دور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی
دور اترا کسی تالے کے جگر میں خنجر

سر ٹپکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمن جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنات گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہے امید کے جلتے ہوئے تیر
(ناتمام)

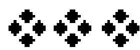


یاد

دشت تنہائی میں، اے جان جہاں، لرزاں ہیں
تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب
دشت تنہائی میں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اٹھ رہی ہے کہیں قربت سے تری سانس کی آنچ
اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم
دور افق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ
گر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے، اے جان جہاں، رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تری یار نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے، گرچہ ہے ابھی صبح فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات



یاد غزال چشماں، ذکر سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کنج قفس بہاراں

آنکھوں میں درد مندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانا نہ وار آئی شام فراق یاراں

ناموس جان و دل کی بازی لگی تھی ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہ وفا شعاراں

مجرم ہو خواہ کوئی، رہتا ہے ناصحوں کا
روئے سخن ہمیشہ سوئے جگر فگاراں

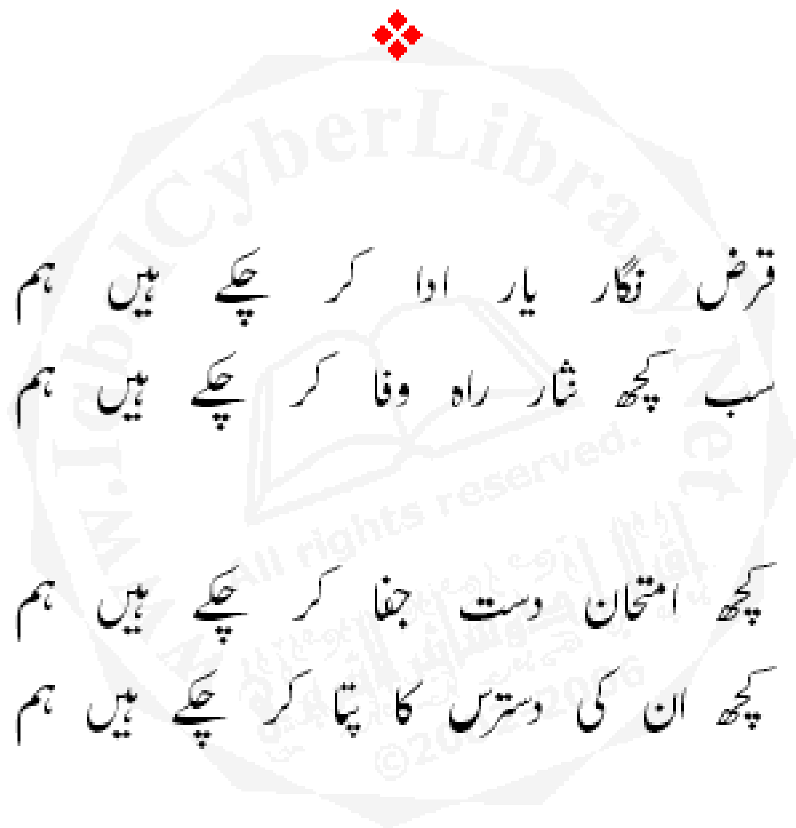
ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیم زہد کر لے
سوئے حرم چلا ہے انبوہ بادہ خواراں

شائد قریب پہنچی صبح وصال ہمدم
موج صبا لیے ہے خوشبوئے خوش کناراں

ہے اپنی کشت ویراں، سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابرو باراں

آئے گی فیض اک دن باد بہار لے کر
تسلیم مے فروشاں، پیغام مے گساراں

❖❖❖



قرض نگار یار ادا کر چکے ہیں ہم
سب کچھ نثار راہ وفا کر چکے ہیں ہم

کچھ امتحان دست جفا کر چکے ہیں ہم
کچھ ان کی دسترس کا پتا کر چکے ہیں ہم

اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم

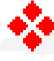
دیکھیں ہے کون کون، ضرورت نہیں رہی
کوئے ستم میں سب کو خفا کر چکے ہیں ہم

اب اپنا اختیار ہے چاہیں جہاں چلیں
رہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم

ان کی نظر میں، کیا کریں، پھیکا ہے اب بھی رنگ
جتنا لہو تھا صرف قبا کر چکے ہیں ہم

کچھ اپنے دل کی خو کا بھی شکرانہ چاہیے
سو بار ان کی خو کا گلا کر چکے ہیں ہم

❖❖❖



میخانے کی رونق ہیں، کبھی خانقہوں کی
اپنالی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلداری واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے



زنداں نامہ

سرآغاز



سید سجاد ظہیر

مقدمہ سازش راولپنڈی کے دنوں میں فیض کے ساتھ میں بھی سنٹرل جیل (حیدرآباد، سندھ) میں تھا۔ دسمبر 1956ء تک ہمارے مقدمے کی سماعت ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں روز روز اسپیشل ٹریبونل کے اجلاس میں جا کر ملزموں کے کٹہرے میں گھنٹوں بیٹھے رہنے اور اس دوران گواہوں کی شہادتوں، وکیلوں کی جرح اور بحث اور معزز ججوں کی فاضلانہ قانونی موشگافیوں سے نجات مل گئی تھی۔ ابھی فیصلہ نہیں سنایا گیا تھا اور ہم امید و بیم کے عالم میں تھے چھٹی وافر تھی انہیں دنوں ایک دن یہ اطلاع ملی کہ دست صبا شائع ہوگئی۔ گو ہم اس کی تمام چیزیں فیض کے منہ سے سن چکے تھے، اور انہیں بار بار پڑھ چکے تھے، لیکن اس خبر سے ہم میں سے تمام قیدیوں کو جو ادب سے مس رکھتے تھے ایک غیر معمولی مسرت ہوئی۔ جیل کے حکام سے اجازت لے کر ہم نے ایک پارٹی بھی کر ڈالی جس میں ہم قیدیوں نے مل کر فیض کو دست صبا کی اشاعت پر مبارک باد دی۔ اس موقع پر منجملہ اور باتوں کے میں نے یہ کہا تھا کہ بہت عرصہ گزر جانے کے بعد جب لوگ راولپنڈی سازش کے مقدمے کو بھول جائیں گے اور پاکستان کا مورخ 1952ء کے اہم واقعات پر نظر ڈالے گا تو غالبًا اس سال کا سب سے اہم تاریخی واقعہ نظموں کی اس چھوٹی سی کتاب کی اشاعت کو ہی قرار دیا جائے گا۔

بہت دنوں سے لوگ جن میں بعض نیک اندیش اور بعض بد اندیش ہیں، اردو ادب اور خاص طور پر اس کی ترقی پسند صنف پر جمود طاری ہونے یا اس کے انحطاط کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں اس نقطہ نظر کو صحیح نہیں سمجھتا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ اردو ادب

کا جدید دور اس کے روشن ترین ادوار میں سے ہے۔ یہ دور تقریباً 1930ء سے شروع ہوتا ہے ابھی تک جاری ہے اور اگر ہم گزشتہ چار پانچ سال کو ہی لے لیں تو میرے خیال میں فیض کی دست صبا اور زنداں نامہ ندیم قاسمی کی شعلۂ گل سردار جعفری کی پتھر کی دیوار احتشام حسین کی تنقید اور عملی تنقید اور مجنوں گورکھپوری کی نقوش وافکار (منجملہ دیگر کتابوں کے) اس دعویٰ میں کافی ہیں کہ تخلیق کا سرخ شعلہ

''جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی''

نا مساعد حالات میں نہ دھیما ہوتا ہے اور نہ بجھتا ہے بلکہ جہل و رجعت کی کالی آندھیاں اسے اور بھی بھڑکاتی ہیں اور اس طرح مجاہدہ اور تصادم کے طوفانوں سے گزر کر اور اس پیکار سے قوت و حرارت حاصل کر کے حق و صداقت کا نور پہلے سے بھی زیادہ درخشاں ہو جاتا ہے اور اس کے حسن اور تاثر میں صد رنگ نئی تابندگیاں جھلملانے لگتی ہیں۔

زنداں نامہ کی بیشتر منظومات فیض نے منٹگمری سنٹرل جیل اور لاہور سنٹریل جیل میں قیام کے دوران لکھیں یعنی جولائی 1953ء سے مارچ 1955ء تک کی لکھی ہوئی چیزیں اس میں ہیں۔ اس درمیان میں ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے کیونکہ ہم دونوں کو چار چار سال قید با مشقت کی سزا دینے کے بعد اہل اقتدار نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم ایک ساتھ جیل میں نہ رکھے جائیں۔ فیض کو پنجاب میں منٹگمری جیل کو بھیجا گیا اور مجھے حیدر آباد سندھ سے بلوچستان کے سنٹرل جیل مچھ کو ہم ایک دوسرے سے خط و کتاب بھی نہ کر سکتے تھے تاہم دوسرے دوستوں کے خطوں اور بعض اردو رسالوں کے ذریعے مجھے فیض کی چند غزلیں اور نظمیں جو اس زمانے میں لکھی گئیں، پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔

اب کہ حالات زندگی میرے لیے کافی خوشگوار ہیں اور میں آزاد فضا میں سانس لے سکتا ہوں، اس کے باوجود جب میں ان ذہنی، جذبات اور روحانی کیفیات کا

خیال کرتا ہوں، جو مجھ پر اس وقت طاری ہوتی تھیں جب اپنے اس محبوب ترین دوست اور ہمدم کا کلام پڑھتا تھا تو اس کا اظہار مشکل معلوم ہوتا تھا شاید بے لاگ تنقید کے لیے یہ بھی اچھا نہیں ہے یہ بھی صحیح ہے کہ چونکہ ہمارے بہت سے تجربے، زندگی اور اپنے وطن کو ثمر بار اور حسین بنانے کے متعلق ہمارے خواب، ہمارا درد، ہماری نفرتیں اور رغبتیں، مشترک تھیں اس لیے فیض کے ان اشعار سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوتا تھا۔ اگر میرا دل کبھی خون کے آنسو روتا تھا کہ قید و بند کے مصائب اور صعوبتیں اس کا حصہ کیوں ہیں جو اپنی حسن کاری سے سب کی زندگی کو اتنی فیاضی سے مرصّع کر دیتا ہے، اور اپنی نغمگی سے ہم سب کی رگوں میں سرور کی نہریں بہا دیتا ہے تو کبھی میرا ذہن اس کی تخیل کی ان شاداں اور فرحاں گل کاریوں سے کب شعور کرتا جہاں جدید جدلیاتی علم کی ضیا پاشیاں، انسانیت کے شریف ترین جذبات سے اس طرح مل گئی ہیں جیسے شعار مہر سے تمہازت۔

فیض کی ان نظموں کو مجموعی حیثیت سے دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ان اقدار کا تعلق ہے، جن کو شاعر نے ان میں پیش کیا ہے، وہ تو وہی ہیں، جو اس زمانے میں تمام ترقی پسند انسانیت کی اقدار ہیں، لیکن فیض نے ان کو اتنی خوبی سے اپنایا ہے کہ وہ نہ تو ہماری تہذیب و تمدن کی بہترین روایات سے الگ نظر آتی ہیں اور نہ شاعر کی انفرادیت، اس کا نرم، شیریں اور مترنم انداز کلام کہیں بھی ان سے جدا ہوتا ہے۔ اس کے متحرک اور رواں استعاروں میں ہمارے وطن کے پھولوں کی خوشبو ہے، اس کے خیالات میں ان سچائیوں اور ان جمہوری مقاصد کی چمک ہے جن سے ہماری قوم کی عظیم اکثریت کے دل روشن ہیں۔ اگر تہذیبی ارتقاء کا مطلب یہ ہے کہ انسان مادی اور روحانی عسرت سے نجات حاصل کر کے اپنے دلوں میں گداز، اپنی بصیرت میں حق شناسی اور اپنے کردار اور استقامت و رفعت پیدا کریں اور ہماری زندگی مجموعی اور انفرادی حیثیت سے بیرونی اور اندرونی طور پر مصفا بھی

ہو اور معطر بھی تو فیض کا شعر غالباً ان تمام تہذیبی مقاصد کو چھو لینے کی کوشش کرتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ پاکستان اور ہندوستان میں اس کی غیر معمولی مقبولیت کا سبب یہی ہے البتہ فیض کے تمام چاہنے والے نقش فریادی دست صبا اور زنداں نامہ کے شیدا ہونے کے باوجود ان سے یہ توقع اور امید رکھتے ہیں کہ کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے ان کی وہ تخلیقیں جو ابھی نہیں ہوئیں، ان کے مقابلے میں جو کہ وہ کر چکے ہیں زیادہ گراں قدر ہوں گی۔

لکھنو، 13 جنوری 1956ء

سجاد ظہیر

روداد قفس

سابق میجر محمد اسحاق

کیمیا گر بغصہ مردہ بہ رنج
ابلہ اندر خرابہ یافتہ گنج

فیض صاحب کی کسی تصنیف کا دیباچہ لکھنے کی سعادت ایک خزانہ پانے سے کم کیا ہو سکتی ہے۔لیکن اس کی دقتوں کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب لکھنے بیٹھا۔کہتے ہیں پرانے زمانے کے راجے مہاراجے جب کسی برگشتہ بخت سفید پوش کی پریشاں حالیوں میں اضافہ کرنا چاہتے تھے تو اسے ایک عدد ہاتھی بخش دیا کرتے تھے معاملہ بعینہ ایسا تو نہیں ہے،لیکن ایک سیدھے سادے فوجی آدمی کے لیے فیض کے کلام کے بارے میں کچھ لکھنا کافی پریشانی کا باعث ہو سکتا ہے اور پھر ایک کسان اور خاص کر نو آبادیاتی ملک کے کسان کے بیٹے کی تربیت ہی کیا ہوتی ہے! دیہاتی سکولوں کی تعلیم اور وہ بھی توہم پرستی اور جہالت کے گھناؤنے سایوں تلے،ایسے ماحول میں جس میں غربت و ناداری کے طفیل پڑھنے لکھنے کی نسبت ہل کی لکیر سیدھی رکھنا،ڈھور ڈنگر کی نگہبانی کرنا اور بیلوں کے لیے چارہ لانا زیادہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے،جہاں ہر نئی شے اور ہر نئے خیال کا حقارت آمیز تمسخر اڑایا جاتا ہے،جہاں دنیا کا بلند ترین خیال اور پاکیزہ ترین جذبہ دو بیگہ زمین کے پیمانے سے ناپا جاتا ہے۔میرا تعلیمی پس منظر ایسا ہی تھا۔فنون لطیفہ میرے اساتذہ کے بس کی بات نہیں تھے،میرا ان سے مس کیا ہوتا۔کتابیں زندگی کا حصہ نہیں تھیں،صرف امتحان پاس

کرنے کا ذریعہ تھیں۔ لائبریریاں، علماء کی محفلیں، علمی مباحثے، مشاعرے، ڈرامے، موسیقی، رقص آرٹ گیلریاں، میوزیم سب مفقود اور چاروں طرف سامراجیوں اور ان کے ملکی ایجنٹوں کے اقتصادی بوجھ تلے کراہتی ہوئی مخلوق!

ایسی روکھی پھیکی تعلیم کے بعد آٹھ دس سال کی فوج کی صاحب بہادری نے رہی سہی کسر نکال دی وہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا تھا اور کالا لوگ کی دوسری زبانوں کو اپنے دیس ہی میں دیس نکالا ملا ہوا تھا یا ان کی حیثیت انگریزی زبان کی لونڈیوں باندیوں کی سی تھی جیل کے چار سال اس لحاظ سے مفید رہے کہ یکسوئی سے مطالعہ کا موقع مل گیا۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ دو ایک پروفیسر بھی ساتھ ہی قابو آ گئے تھے۔

زنداں نامہ کا دیباچہ لکھنے کے بہانے میں اپنی سوانح عمری لکھنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی مشاہدے کی صحیح جانچ اسی وقت ہو سکتی ہے جب شاہد کے مقام اور اس کی صلاحیتوں کا پورا پورا تعین کر لیا جائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں کچھ مہینے کم چار سال دن رات فیض کے ساتھ رہا ہوں۔ یہ طویل عرصہ ہم نے جیل کے ایک ہی احاطے میں ملحقہ کوٹھڑیوں میں گزارا ہے، سینکڑوں مرتبہ صبح سویرے سب سے پہلے ایک دوسرے کے منہ لگے ہیں، اپنی خوشیاں اور غم باہم بانٹنے پر مجبور رہے۔ جیل کے باہر آدمی سینکڑوں لوگوں کو ملتا ہے ملتا نہ بھی ہو تو دیکھ ضرور لیتا ہے۔ کئی قسم کی آوازیں سنتا ہے، بیسوں مناظر سے واسطہ پڑتا ہے۔ کسی سے نفرت ہے تو کنی کترا کے نکل سکتا ہے، کسی سے محبت ہے تو ملاقات کی راہیں ڈھونڈ لیتا ہے یا ان کی تلاش میں جی بہلا لیتا ہے۔ جیل میں آدمی کی مرضی اس سے چھین لی جاتی ہے اور اس کی نقل و حرکت محدود کر دی جاتی ہے۔ وہاں کی کائنات دو چار قیدی، دو چار پہرے دار، کچھ کوٹھڑیاں اور کچھ دیواریں، ایک آدھ درخت، ایک دو گلہریاں نصف درجن کے قریب چھپکلیاں اور کچھ کوے اور دوسرے پرندے ہوتے ہیں، جن میں مہینوں بلکہ سالوں تک تبدیلی نہیں آتی۔ مجھے اس چھوٹی سی دنیا

میں فیض صاحب کے ساتھ مسلسل چار سال تک رہنے کا موقع ملا ہے۔لیکن اس طویل قرب کے باوجود ضروری نہیں ہے کہ میں اپنے موضوع سے پورا انصاف کر سکوں۔ایک اندھا کائنات کی رنگا رنگی میں عمر گزار کر بھی رنگوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ کئی لوگ اچھی بھلی نظر رکھتے ہوئے بھی بعض رنگوں کو نہیں پہچان سکتے۔ ریڈیو پروگرام سننے کے لیے طاقتور ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں ریسیونگ سیٹ بھی نقائص سے پاک ہونا چاہیے۔

یہاں پر زنداں نامہ کی نظموں اور غزلوں پر تنقید و تبصرہ اگرچہ میرا مقصود نہیں پھر بھی شاعر کے بیان میں ان کا ذکر نا گزیر ہے۔فیض کی لطافت کا بیان میرے بس کی بات نہیں ہے۔اثر لکھنوی کی زبان میں فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اس نقطہ عروج پر ہے جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو۔تخیل نے صناعت کے جوہر دکھائے ہیں اور معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول، ایک طلسمی فضا میں اس طرح مست پرواز ہے کہ ایک پر ایک کی چھوٹ پڑ رہی ہے اور قوس قزح کے عکاس بادلوں سے ست رنگی بارش ہو رہی ہے ہر کوئی بقدر ظرف اس لطافت سے بہرہ اندوز ہو سکتا ہے۔میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے فہم کے مطابق، چیدہ چیدہ نظموں کا پس منظر بیان کر دوں۔اتنا خیال رہے کہ صحیح ادب اپنے پس منظر کی حدود و قیود کو توڑ کر بہت آگے نکل جاتا ہے۔فیض کی شاعری کو اس کے پس منظر کے سانچے میں محدود کر کے دیکھنا ظلم ہے۔اس لیے میری کاوشوں کو ایک سائن بورڈ سے زیادہ حیثیت نہیں دینی چاہیے۔آگے راستہ سب کا اپنا اپنا ہے اور اپنی اپنی ہمت۔

فیض صاحب 9 مارچ 1951ء کو قید ہوئے اور اپریل 1955ء میں رہا ہوئے۔اس طرح ان کی اسیری کے دن کچھ اوپر چار سال بنتے ہیں۔اس عرصہ میں وہ پہلے تین مہینے سرگودھا اور لائل پور کے جیلوں میں قید تنہائی میں رہے۔اس کے

بعد جولائی 53ء تک حیدر آباد (سندھ) جیل میں راولپنڈی سازش کیس کے باقی اسیروں کے ساتھ رہے۔ جولائی 1953ء میں ہم سب کو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر لاہور، منٹگمری، مچھ (بلوچستان) اور حیدر آباد کے جیلوں میں بھیج دیا گیا۔ فیض صاحب کے لیے میرے اور کپٹن خضر حیات کے ہمراہ منٹگمری سنٹرل جیل کا انتخاب کیا گیا۔ لیکن وہ چونکہ بغرض علاج کراچی چلے گئے تھے، اس لیے کہیں 1953ء میں جا کر ہمارے پاس منٹگمری پہنچے۔ یہاں سے ہم اکٹھے رہا ہوئے۔

مجھے فیض صاحب کی گرفتاری کے کوئی تین ماہ بعد مئی 1951ء میں گرفتار کیا گیا تھا۔اس لیے خلق خدا کی سرگوشیاں سنتا رہا، فیض صاحب کے ساتھ اس دوران میں ان کے عزیزوں دوستوں کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ نہ ہی وہ کسی سے خط و کتابت کر سکتے تھے۔ان کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں۔اور قید میں ان کے ساتھ سلوک کے بارے میں عجیب عجیب لرزہ خراش قصے مشہور تھے۔ جب پہلی بار ان سے حیدر آباد جیل میں ملاقات ہوئی تو بارے اطمینان ہوا۔وہی خندہ پیشانی، وہی چمکتی ہوئی آنکھیں، وہی گوتمی مسکراہٹ جس کا نور سب طرف پھیل رہا تھا، اور پھر وہ فاتح عالم محبت، جس سے ان کے جاننے والے مانوس ہیں۔

جیل ایک طرح کا طلسماتی آئینہ خانہ ہوتا ہے جہاں صورتوں کے نہیں سیرتوں کے عکس عجیب و غریب شکلیں بنا کر ظاہر ہوتے ہیں۔کسی کی طبع جھگڑے کی طرف مائل ہے تو وہ ہر کسی سے لڑائی مول لینے کی فکر میں ہوگا۔کوئی بزدل طبیعت کا ہے تو وہ گوبر کے کیڑے کی طرح ہر وقت سر چھپانے کی دھن میں ہوگا۔کسی کی مزاج میں قنوطیت ہے تو وہ ہر اچھی بری خبر سے اپنی دل شکنی کے اسباب ڈھونڈ لائے گا۔کسی کو کوئی خبط ہے تو وہ دیوانگی کی حد تک ترقی کر جائے گا۔طبیعتوں میں کمینگی اور تنگ نظری خاص طور پر پھیلتی پھولتی ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اپنے ساتھیوں اور جیل

والوں سے جھگڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے انسان کی ساری کائنات جیل کی چار دیواری میں محدود کر دی جاتی ہے اور اس کے فکر و نظر میں تنگی آ جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انسانوں پر حیوانی بندشیں عاید کر دی جاتی ہیں۔ کوٹھڑی میں بند کرنا، ایک احاطے میں محصور کر دینا، بیڑیوں کا استعمال، عزیزوں اور دوستوں سے ملاقات پر پابندیاں، بے بسی کا عالم، یہ سب چیزیں اسیروں کے دل پر نوک سوزن کا کام کرتی ہیں۔ جیل کے بعض افسر بھی قیدیوں کی دل شکنی کے مواقع ڈھونڈتے ہیں اور قیدی کی عزت نفس اور وقار کو ٹھیس پہنچانے میں خاصے ماہر ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات سب کے بارے میں صحیح نہیں۔

ان حالات میں ایک آدمی قید ہو کر اگر اپنی روزمرہ کی شخصیت قائم نہ رکھ سکے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کمال ان لوگوں کا ہے جو جیل جا کر بھی وضع داری قائم رکھ سکتے ہیں۔ جن لوگوں کو میں جیل جانے سے پہلے جانتا تھا ان میں فیض صاحب ہی ایسے تھے جو بظاہر ٹس سے مس نہ ہوئے۔ لیکن عام لوگوں کی طرح طبیعتوں کا بوجھ کم کرنے کے لیے لڑائی جھگڑے، دنگہ فساد اور اسی قسم کے دوسرے سیفٹی ویلو (Safety Valve) استعمال نہ کرنے سے فیض صاحب پر جو ذہنی اور جسمانی فشار پڑا وہ ان کے دوستوں سے مخفی نہیں۔ شاعری غنیمت تھی، جس کے ذریعے دل کا غبار نکال لیا کرتے تھے۔ لیکن شاعری بذات خود دل و جگر کے ایندھن پر جلا پاتی ہے۔

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!

حیدر آباد میں دوران مقدمہ کے دن بھی عجیب دن تھے۔ تین مہینوں سے ٹوڈی قسم کے لوگ اخباروں، اشتہاروں، جلسوں، جلوسوں میں ہمیں گولی کا نشانہ بنانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ بعض اخباروں نے غدار نمبر نکال دیے تھے۔ کچھ اس قسم کا

ماحول پیدا کر دیا گیا کہ ملک میں ہر مرد آزاد یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کو بھی سازش میں دھر لیا جائے گا۔ چاروں طرف ایک دہشت اور سراسیمگی کی فضا تھی اور ہمارے رشتہ دار اور دوست ہماری جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ لیکن جیل کے اندر ہماری اپنی یہ حالت تھی کہ گویا کسی پلنگ پر آئے ہوئے ہیں۔ سب طرف ہنسی مذاق تھا، قہقہے تھے، امید تھی، حوصلہ تھا۔ قوالیاں ہوتی تھیں سوانگ بھرے جاتے تھے! اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ ہمیں اپنی بریت پر بھروسا تھا اور دوسری شاید یہ ہو سکتی ہے کہ بہت بڑے خطرے کے سامنے آدمی عموماً دو ہی راستے اختیار کرتا ہے یا تو الٹے پاؤں بھاگ اٹھتا ہے یا مقابلے کی ٹھان لیتا ہے۔ موخر الذکر کی بھی آگے دو صورتیں ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم میں بعض ایسے بھی ہوں گے جو مصائب کی ہولناکیوں کے روبرو لرز لرز کر ہنس رہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے کہ

عشرت قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ!
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

یہ صورت حال حیدر آباد سے مخصوص نہیں تھی، لاہور کے چند روز کے قیام میں بھی ہماری یہی حالت رہی تھی چنانچہ لاہور کے برڈ وڈ بیرکس (Bird Wood Barracks) میں پولیس کی تحویل میں دیے جانے کے کوئی پانچ منٹ بعد مئی 1951ء میں گرفتار ہونے والے ساتوں فوجی افسر، ظفر اللہ پوشنی کی قیادت میں فضول قسم کے فوجی کورس (Chorus) الاپ رہے تھے (اس قسم کے بے ضرر لغویات کی چھوٹے فوجی افسروں کو خاص موقعوں پر اجازت ہوتی ہے) لاہور جیل کا ایک واقعہ یاد کرتا ہوں تو اب بھی ہنسی آجاتی ہے وہاں ہمیں بم کیس وارڈ (Bomb Case Ward) میں رکھا گیا (یہ وارڈ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے لیے خاص طور پر تعمیر کیا گیا تھا) اس کے صحن میں ایک بارہ دری سی ہے، جس کے دروازوں میں لوہے کی مضبوط جالی لگی ہوئی ہے۔ رات کو ہم یہیں سویا کرتے تھے۔

ایک دن سونے کی تیاری میں تھے کہ ایک بوڑھا سنتری جالی سے لگ کر اندر جھانکنے لگا۔ خضر حیات نے پوچھا، بابا تمھیں ہم قید میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے کہا جی ہاں جناب خضر حیات بولا لیکن بابا تو تم قید میں نظر آتے ہو اس پر بوڑھا سنتری پہلے تو بوکھلا سا گیا۔ پھر اس زور سے ہنسنے لگا کہ ہم بھی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے ایک نشہ تھا جس میں سب مگن تھے۔

جو تجھ سے عہد وفا استوار رکھتے ہیں
علاج گردش لیل و نہار رکھتے ہیں

لاہور ہی کا ایک لطیفہ یاد آ گیا ایک دن ہمیں ریمانڈ کے لیے عدالت میں لے جایا جانا تھا۔ اطلاع ملی کہ سید سجاد ظہیر بھی ساتھ جائیں گے۔ جیل کے بڑے دروازے کے اندر پولیس کی قیدی ڈھونڈنے والی گاڑی کھڑی تھی۔ ہم وہاں رک گئے اور سید صاحب کا انتظار کرنے لگے اتنے میں پھانسی کی کوٹھیوں کی طرف سے سفید شلوار کرتے میں ملبوس، سر پر جناح کیپ جمائے، ایک بھاری بھرکم، زندگی سے مطمئن شخص آتا دکھائی دیا۔ ہمارے درمیان چہ مگوئیاں ہونے لگیں کہ کیا یہ سجاد ظہیر ہو سکتا ہے۔ ہم میں سے ان کے ساتھ کسی کی بھی جان پہچان نہیں تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کمیونسٹ نہایت قبیح صورت، درندہ سیرت انسان ہوتے ہیں۔ داہنے بائیں پستول لگاتے ہیں۔ پیٹ پر پیش قبض باندھتے ہیں۔ بڑی بڑی مونچھیں اور خونخوار آنکھیں رکھتے ہیں اور ان کا موضوع سخن قتل و غارت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ سجاد ظہیر چونکہ پاکستان کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری تھے، اس لیے ان لوگوں کے خیال میں ان کے منہ سے ہر سانس میں آگ نکلنی چاہیے تھی اور ان کو اس قسم کا کائیاں انسان ہونا چاہیے تھا کہ ڈبکی لگائے تو جیل سے باہر چلا جائے۔ یہ شخص جو نرم چال، پاکیزہ خدوخال اور ایک عدد عالمانہ توند لیے ہوئے تھا سجاد ظہیر کیسے ہو سکتا تھا۔ ہمارے یہ ساتھی اپنی رائے پر اس شدت سے مصر تھے گویا یہ ان کا جزو ایمان

ہے۔ چنانچہ چاروناچار ہم سب نے تسلیم کرلیا کہ یہ سجاد ظہیر نہیں ہو سکتے، کشمیری بازار کے شیخ ہوں گے یا پولیس کے کوئی خضر صورت ایجنٹ، چنانچہ عدالت تک تمام سفر میں ہم گم سم بیٹھے ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھتے رہے۔ عدالت میں جب وہ کھڑے ہو کر گرجے کہ جناب والا پندرہ دن ہو گئے ہیں اور مجھے ابھی تک یہ نہیں بتایا گیا کہ میں کس جرم میں گرفتار کیا گیا ہوں یہ بالکل لغو (Preposterous) بات ہے تو ہمیں یقین ہو گیا کہ وہ سجاد ظہیر ہیں۔ ریمانڈ کے لیے ہمیں جج صاحب کی کوٹھی میں لے جایا گیا تھا۔ وہاں پولیس گاردوں اور گاڑیوں کی اتنی گہما گہمی تھی کہ کوٹھی کی اوپر کی منزل میں بہت سے لوگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ ضیاء الدین نے اشارے سے مجھے بلا کر کہا بھئی ایسے بیٹھے ہو جیسے مویشی چرانے آئے ہو۔ سیدھے ہو کر بیٹھو۔ کالر ٹھیک کرو۔ ذرا ذرا مسکراؤ دیکھتے نہیں ہو، پبلک دیکھ رہی ہے اور خود بھی تن کر ایسے بیٹھ گیا کہ گویا تصویر اتروانے آیا ہو۔ ایئر کموڈور جنجوعہ سے میری پہلی ملاقات وہیں ہوئی۔ انہوں نے مصافحہ کرتے ہوئے میرے ہاتھ کو اس پھرتی سے نچوڑا کہ اب تک یاد ہے۔

حیدر آباد کی عدالت کی عمارت جیل کے اندر تھی۔ عدالت کا وقت آٹھ سے بارہ بجے تک ہوتا تھا۔ ہفتہ اور اتوار کے دن خالی ہوتے تھے۔ شام کے وقت کبھی کبھی ہمارے وکلاء مشورے کے لیے آجایا کرتے تھے۔ باقی وقت ہمارا اپنا ہوتا تھا ایک ہی احاطے میں سب کے لیے جگہ نہیں تھی۔ اس لیے فیض صاحب، محمد حسین عطا، جنرل اکبر خان، بریگیڈیئر صادق خان، کرنل ضیاء الدین، کرنل نیاز محمد ارباب، میجر حسن خان، کیپٹن ظفر اللہ پوشنی، کیپٹن خضر حیات اور میں ایک احاطے میں رکھے گئے اور سید سجاد ظہیر، جنرل نذیر احمد ایئر کموڈور جنجوعہ اور بریگیڈیئر لطیف خان کو ایک دوسرا احاطہ دیا گیا۔ بیگم اکبر خان کے لیے علیحدہ انتظام تھا۔ کھانے کا بندوبست ہماری طرف تھا۔ ہمیں ظہور احمد اور عادل خان دو قیدی نہایت اچھا پکانے والے ملے

ہوئے تھے اور کھانے کا انتظام ایک باقاعدہ آفیسرز میس (Officers Mess) کی طرز پر تھا۔ جس کا سیکرٹری گاہے گاہے چنا جاتا تھا۔ شام کے وقت والی بال اور بیڈمنٹن بھی ہمارے احاطے میں ہی کھیلے جاتے تھے۔ چنانچہ مشترکہ سرگرمیوں کا مرکز یہی احاطہ تھا۔ مشاعرے، قوالیاں، ڈرامے عموماً یہیں ہوتے تھے۔ سید سجاد ظہیر والے احاطے میں ہم چھٹی کے دن کی صبح کو جایا کرتے تھے جہاں کافی اور بسکٹ سے تواضع ہوتی تھی اور ادبی اور سیاسی گفتگوئیں ہوتی تھیں۔

مرزا سودا کے غنچے کی طرح فیض صاحب کی بیاض برداری کا کام میرے سپرد تھا۔ جب وہ مجلس مشاعرہ کی طرف یا سجاد ظہیر کے ہاں جاتے تو میں نوٹ بک اٹھائے پیچھے پیچھے ہوتا۔ دوسرے رفیق جب ہمیں اس طرح جلوس میں چلتا دیکھتے تھے چاروں طرف خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ اس لیے کہ جیل میں فیض صاحب کے تازہ کلام کا ورد مسعود جشن سے کم نہیں ہوتا تھا اور پھر جس ادا سے ہم چلتے تھے، وہ بھی خوش طبعی کی ایک اچھی خاصی مزاحیہ صورت ہوتی تھی۔ فیض صاحب خراماں خراماں مسکراتے ہوئے، گھبرائے ہوئے، شرمائے سے چلتے تھے اور میں ایک لٹھ بند جاٹ کی طرح گردن اکڑائے، ناک آسمان کی طرف اٹھائے لوگوں کے سروں کے اوپر سے دیکھتا ہوا چلتا تھا اور جب تک فیض صاحب کے تشریف رکھنے پر نہایت مودب لیکن باوقار انداز میں بیاض ان کی خدمت میں پیش نہیں کر لیتا تھا، میاں غنچہ اور مجھ میں اتنا فرق ضرور تھا کہ مرزا سودا جب کسی پر ناراض ہوا کرتے تھے تو غنچہ کو صرف قلم دان آگے بڑھانا ہوتا تھا۔ باقی مرزا خود بھگتا لیا کرتے تھے۔ یہاں یہ صورت تھی کہ فیض صاحب تو ہمیشہ سے با دشمناں مروت با دوستاں مدارا کے قائل رہے ہیں اور رو برو کسی سے ناراض ہوتے ہی نہیں اور غنچہ ثانی ان دنوں دوست دشمن سب کی سرکوبی کو ہروقت مستعد رہتے تھے۔

حیدر آباد میں فیض صاحب، میں اور عطا ملحق کمروں میں رہتے تھے۔ میں اور

عطا ان کے سب موڈوں سے واقف ہو گئے تھے۔ شعر کا عالم طاری ہوتا تھا تو فیض صاحب خاموش ہو جایا کرتے تھے۔ البتہ اٹھتے بیٹھتے گنگنا چکنے کے بعد ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ ہم بھانپ لیتے تھے کہ سامعین کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم دونوں کئی کانفرنسوں اور لگاتار سرگوشیوں کے بعد موج کی مناسبت کا اندازہ لگا کر، گورونانک دیو جی کے بھائی بالا اور مردانہ کی طرح حضور شاعر پہنچ جاتے تھے اور ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد غزل یا نظم کا مطالبہ شروع کر دیا کرتے تھے کہ اب بہت عرصہ ہو گیا اور لوگ کہیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اگر نظم یا غزل تیار ہوتی تھی تو ایک آدھ شعر سنا دیا کرتے تھے ورنہ حکم ہوتا کہ بھاگ جاؤ۔ ہم سمجھ جاتے تھے کہ اس انکار میں اقرار مخفی ہے اور بات پھیلا دی جاتی تھی کہ

معنی کی سرزمیں پہ نزول سروش ہے

ان کے نواح میں شوروغوغا، دنگا فساد، لڑائی جھگڑا، حتی الامکان بند کر دیا جاتا تھا۔ فیض صاحب نے بہت نازک طبع پائی ہے۔ ہمسائے میں تو تو میں میں ہو رہی ہو، دوستوں میں تلخ کلامی ہو، یا یونہی کسی نے تیوری چڑھا رکھی ہو، ان کی طبیعت ضرور خراب ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی شاعری کی کیفیت کافور ہو جاتی ہے۔ جو لوگ عطا اور مجھے جانتے ہیں وہ زیر لب مسکرا رہے ہوں گے کہ یہ حضرات جن کو شاعری دیکھ پائے تو نثر میں منہ چھپائے۔ فیض صاحب کی طبیعت پر کیونکر بار نہیں ہو جاتے تھے! اس کا بھید فیض صاحب ہی کھول سکتے ہیں۔

حیدر آباد میں قریباً ہر پندرھواڑے ایک مجلس مشاعرہ منعقد کرنے کا رواج ہو گیا تھا۔ یہ مشاعرہ کبھی طرحی ہوتا تھا کبھی غیر طرحی اور سبھی کو اس میں حصہ لینا پڑتا تھا۔

دست صبا میں مندرجہ ذیل مصرعوں پر کہی ہوئی غزلیں موجود ہیں

1 ذکر مرغان گرفتار کروں یا نہ کروں

2 آج کیوں مشہور ہے ہر ایک دیوانے کا نام

3 دیکھنا وہ نگہ ناز کہاں ٹھہری ہے

4 وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

فیض کی غزل وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں حسرت موہانی کی ایک غزل پر کہی گئی ہے۔

میرے ذہن میں فیض صاحب کی جیل کی شاعری کے چار رنگ ہیں (یا موڈ کہہ لیجئے) پہلا رنگ سرگودھا اور لائل پور کے جیلوں میں ان کی تین مہینوں کی قید تنہائی کا ہے۔ وہ بہت مشکل دن تھے۔ کاغذ، قلم، دوات، کتابیں، اخبار، خطوط سب چیزیں ممنوع تھیں۔ انہوں نے اس طرف اشارہ بھی کیا ہے

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے

کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے

ہر ایک حلقہء زنجیر میں زباں میں نے

صرف ایک شمس الدین تھے جو نوابوں، جنوں، بھوتوں، دیووں، پریوں، عاملوں، معمولوں سے اپنے معاملات کے قصے سنا کر فیض صاحب کا جی بہلایا کرتے تھے۔ حیدرآباد میں تو فیض صاحب ان کے ذکر سے بھرپور تھے۔ آج کل بھی اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔ اس قید تنہائی کا ان پر اتنا اثر ہوا تھا کہ حیدرآباد پہنچنے پر وہ اکیلا رہنے سے بہت وحشت کھاتے۔ اپنی اپنی کوٹھڑیوں کے علاوہ ایک ہال بھی ہمارے سپرد کیا گیا تھا۔ ہمیں اجازت تھی کہ جہاں چاہیں بستر جما لیں۔ ہن اپنے اپنے کمرے میں رہنا چاہتے تھے۔ لیکن فیض صاحب ہال میں رہنے پر مصر تھے۔ کہتے تھے کہ تمہیں میری تنہائی میں رہنا پڑتا تو دوستوں کی صحبت کی قدر ہوتی۔ لیکن ان پر یہ حالت زیادہ دیر طاری نہ رہی اور کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اب ان کا بیشتر وقت ہمیں اپنے کمرے سے نکالنے میں صرف ہوتا تھا۔

☆ v۔۔ شمس الدین سی کلاس کے قیدی تھی جوان کا کھانا تیار کرتے تھے۔یوپی کے رہنے والے تھے☆

فیض صاحب کہا کرتے ہیں کہ ان دنوں ان کی طبیعت میں بہت زوروں کی آمد تھی اور طرح طرح کے مضامین سوجھ رہے تھے۔اس دوران کا کلام کچھ تو ان کے ذہن سے اتر گیا۔جو بچ گیا وہ دست صبا میں مندرجہ ذیل مندرجات پر مشتمل ہے

متاع لوح وقلم

دامن یوسف

طوق ودار کا موسم (پہلا حصہ)

تراجمال نگاہوں میں لے کے اٹھا ہوں

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے
تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام

کچھ کلام ایسا بھی ہے جو صرف سینہ بہ سینہ چل سکتا ہے اور جس سے فیض صاحب صرف مخصوص دوستوں کو نوازتے ہیں

ان کی شاعری کا دوسرا رنگ حیدر آباد کا ہے۔یہاں ہمیں ہر طرح کا جسمانی آرام جو جیل میں ممکن ہوسکتا ہے میسر تھا

گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کی سی حالت تھی کہ ظاہری آرام وآسائش کے پردے میں ہزاروں حسرتوں کا خون اور لاکھوں تمناؤں کا قبرستان تھا ہمارے خلاف کئی تعزیری دفعیں ایسی لگی ہوئی تھیں جن کی سزا موت تھی۔اس کے ساتھ صفائی پیش کرنے کی سہولتیں بہت حد تک

ہمیں میسر نہیں تھیں۔ لیکن ہم نے سمجھ رکھا تھا

در بیاباں گر بشوق کعبہ خواہی زد قوم
سرزنشہا گر کند خار مغیلاں غم مخور

اور وقتی طور پر شور و غوغا، ہاؤ ہو، گالی گلوچ کے ذریعے آنے والے خطرے کی آہٹ کو دبائے ہوئے تھے۔ ڈیڑھ دو سال ہمارا موضوع سخن صرف فتح رہا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے سامنے کسی نے کبھی شکست کا ذکر کیا ہو۔ ہم سمجھتے تھے کہ ایسا ذکر ایک دفعہ شروع ہو گیا تو نہیں رکے گا۔ ہم فوج کے اس مشہور مقولے پر عمل کر رہے تھے کہ جب مدافعت کی صورت نہ رہے تو دھاوا بول دو۔ چنانچہ شروع دن سے ہم عدالت کے اندر حسب توفیق غلغلہ اندازی کرتے رہے۔ فیض صاحب نے اس میں بہت کم حصہ لیا۔ لیکن ہمیں کبھی روکا بھی نہیں وہ اپنا جوش ولولہ اپنے شعروں میں منعکس کر لیا کرتے تھے۔

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوان ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرم وفا دیکھیے کس کس پہ ہو ثابت
وہ سارے خطا کار سر دار کھڑے ہیں

یہی جنوں کا یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم
بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغ گلشن و صوت ہزار کا موسم

ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری

ہے

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی حجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنت منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

عجز اہل ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

دیکھنے والے دیکھیں گے کہ دست صبا کے دوسرے حصے میں جوش وخروش کا وہ عالم نہیں جو پہلے نصف میں ہے۔اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ کچھ عرصہ مقدمہ کی سماعت ہو چکنے کے بعد ہمیں امید ہو چلی تھی کہ اگر عدالت کی کارروائی میں دلچسپی لیں تو شاید بہتری کی کوئی صورت نکل آئے۔اس لیے سوچ بچار نے شوریدہ سری پر سبقت لے لی تھی۔اس کی دوسری وجہ ان کے بھائی کی اندوہناک موت تھی۔وہ حیدرآباد ان سے ملنے آئے اور اپنے ایک روحانی پیشوا کی طرف سے ان کی رہائی کی خوشخبری لائے تھے۔ابھی حیدرآباد میں ہی تھے کہ 18 جولائی 1952ء کی صبح کو نماز پڑھتے ہوئے اس دنیا سے رحلت کر گئے۔فیض صاحب کو اتنا صدمہ ہوا کہ مہینوں تک نیم مردہ حالت میں رہے۔ایک دن تو چارپائی سے اترتے ہوئے بے ہوش ہو کر فرش پر گر پڑے۔آواز سن کر میں اور عطا بھاگے بھاگے گئے اور زمین سے اٹھا کر بستر پر لٹایا۔یہ گھاؤ ابھی تک بھرا نہیں ہے۔گو انہوں نے حسب عادت اسے کیمو فلاج (Camouflage) کرلیا ہے۔

فیض صاحب کی کیموفلاج کرنے کی عادت بھی عجیب ہے۔کئی دفعہ ایسا ہوا کہ

سگریٹ ختم ہو گئے لیکن بجائے اس کے کہ ساتھیوں سے مانگ لیں بے قراری دور کرنے کے لیے احاطہ کے چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ اس بے قراری کی تشخیص میں ہمیں کافی عرصہ لگا۔ ان کو چھپکلوں سے بہت گھن آتی تھی۔ میرے خیال میں خوف کھاتے تھے۔ ایک دن ہم سب برآمدے میں چارپائیاں ڈال کر سونے کی تیاری میں تھے کہ فیض صاحب نے دفعتاً اٹھ کر ادھر ادھر چکر کاٹنے شروع کر دیے۔ عطا کی چارپائی پاس ہی تھی۔ اس نے سوچا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ ہاتھ کی طرف دیکھا تو سگریٹ سلگ رہا تھا۔ فیض صاحب کی نظروں کا پیچھا کیا، دیکھا کہ ان کی نظریں بار بار چھت کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ چارپائی کے پاس آتے تھے اور آگے نکل جاتے تھے اور گھوم کر یہی عمل دہراتے تھے۔ عطا نے چھپکلی کو دیکھ لیا اور اٹھ کر فیض صاحب کی چارپائی کھینچ کر ایک طرف کر دی۔

تیسرا رنگ کراچی کا ہے جہاں فیض صاحب دو ماہ کے لیے مقیم رہے۔ دراصل یہ رنگ دوسرے اور چوتھے کی درمیانی کڑی ہے۔ کراچی میں ہسپتال میں فیض صاحب جیل کی نسبت قدرے آزاد فضا میں رہے۔ دوستوں کے ساتھ بغیر کسی قباحت کے ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ وہاں انہیں بوجوہ آزادی کی نعمتوں کا شدت سے احساس ہوا۔ اس شدید احساس کے بعد جب وہ منٹگمری آئے تو قید کا احساس بھی شدت پکڑ گیا اور ان کی شاعری میں ظاہر ہوا۔ اسی لیے انہوں نے کراچی اور منٹگمری میں لکھی ہوئی غزلوں اور نظموں کے مجموعے کا نام زنداں نامہ تجویز کیا ہے۔

کراچی میں فیض صاحب نے اپنی معرکتہ الارا نظم ملاقات لکھی۔ اس نظم کا پہلا بند اکتوبر 1953ء میں منٹگمری آ کر مکمل ہوا تھا اور دوسرا اور تیسرا نومبر میں اسے کراچی سے اس لیے منسوب کر رہا ہوں کہ وہ اس کے جراثیم کراچی سے لائے تھے۔ اس میں اس ماہی بے آب کی تڑپ ہے جس پر جانسوز محرومی کے بعد کچھ پانی چھڑک دیا گیا ہو اور وقتی سکون کے باوجود اسے اس بات کا شدت سے احساس ہو کہ

تھوڑا سا پانی جو اسے میسر آیا ہے، سوکھنے والا ہے۔ یہ نظم درد کی انتہائی شدت کے ساتھ انتہائی تسکین کی بھی مظہر ہے۔ اس میں ایمان وایقان کی جگمگاہٹ بھی ہی، اس میں انسانی حوصلہ، عزم اور حکمت کا راگ بھی گایا گیا ہے۔ ایسا حوصلہ، عزم اور حکمت جو صرف آج کے انسان کا طرہ امتیاز ہیں جو دھرتی ماتا پر نہایت مضبوطی سے قدم جما کر ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے اور مہتاب پر شبخون مارنے کی فکر میں ہے، جو پانی، ہوا، دریا، سمندر، برق وباراں اور کائنات کی دوسری پریوں اور دیووں کو مسخر کر چکا ہے، یا ان کی تسخیر کیا چاہتا ہے، جس کی سینکڑوں، ہزاروں سالوں کی الم نصیبی اور جگر فگاری کے انبار آج اس کے لیے حرکت اور حرارت کا منبع بنے ہوئے ہیں۔

فیض صاحب کی جیل کی شاعری کا چوتھا رنگ منٹگمری کا ہے۔ یہاں ہمیں کم و بیش حیدر آباد کی سی سہولتیں میسر تھیں۔ جیل کے ارباب اقتدار بھی نیک دل لوگ تھے، جو جیل کے قواعد وضوابط سے سرمو انحراف نہ کرنے کے باوجود ہماری دل شکنی نہیں ہونے دیتے تھے۔ ان میں بعض اچھے ذوق کے لوگ بھی تھے جو ہمارے ساتھ ادبی چھیڑ چھاڑ جاری رکھتے تھے۔ ایک صاحب کو تو ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ ان کے آنے کے کچھ ہی لمحوں کے بعد فیض صاحب طوطی کی طرح چہچانے لگتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ دشمنوں نے ان پر کم گوئی کا الزام تراش لیا ہے۔ ان صاحب کو چرکیں سے لے کر مرزا غالب تک کے سب شعراء کے کچھ نہ کچھ بھلے برے شعر یاد تھے اور انہوں تیرتھ رام فیروز پوری کے ناولوں سے لے کر سعادت حسن منٹو کی کہانیوں تک سب کچھ پڑھ رکھا تھا۔ وہ آتے ہی علیک سلیک کے بعد شروع ہو جاتے اور فیض صاحب کی طرف سے توجہ ہونے نہ ہونے کی پروا کے بغیر یہاں سے وہاں، وہاں سے کہیں اور کچھ نہ کچھ کہتے رہتے، حتیٰ کہ فیض کی کوئی ایسی رگ چھڑ جاتی کہ غصے میں یا موج میں آ کر ان سے کچھ کہے بغیر رہا نہ جاتا۔

منٹگمری میں فیض صاحب کو اپنی بیوی بچوں اور دوسرے دوستوں رشتہ داروں

سے ملاقات میں بھی آسانیاں تھیں۔ دل بہلاوے کے لیے ہم نے اپنے احاطے کے اندر ایک پھلواڑی بھی بنالی تھی جس کا سلسلہ بڑھتے بڑھتے سارے جیل میں پھیل گیا تھا بلکہ جیل کے باہر بھی لوگوں کو پھولوں کی پنیری مہیا کی جاتی تھی۔ فیض کو پھولوں کا شوق اتنا تھا کہ انہوں نے ولایت سے اپنی خوشدامن اور ایک دوست کے ذریعے پھولوں کے بیج منگوائے۔ پھول ایک بڑھنے پھولنے پھلنے کی چیز ہے۔ ان سے جیل میں خوب جی بہلتا ہے، اور کوئی نہ کوئی نئی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آدمی قید کا ایک ایک دن گننے کی بجائے موسم گننے لگتا ہے جو طویل سے طویل قید میں بھی انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی نظریں مستقبل کی طرف رہتی ہیں کہ آنے والے موسم میں پھول لگانے کے لیے کیا کیا بندوبست کرنا ہے اور گزشتہ غلطیوں کے اعادے سے بچاؤ کی کیا صورت ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود منٹگمری میں فیض صاحب کو قید کا بہت شدید احساس تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حیدر آباد سے تبدیلی پر یاروں دوستوں سے جدائی کا بہت قلق تھا۔ ایک طرح سے بھرا گھر اجڑ گیا تھا۔ دوسری وجہ سے بیان کر چکا ہوں کہ کراچی کے دوران قیام کی نسبتاً آزاد فضا کے بعد قید کا بوجھ زیادہ تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ سب سے بڑی وجہ شاید یہ تھی کہ مستقبل قریب میں رہا ہو جانے کی امید کا جو موہوم سا چراغ اب تک جلتا رہا تھا وہ اب خاموش ہو چکا تھا اور شروع شروع کی قید تنہائی کا رنگ ایک حد تک عود کر آیا تھا۔ درد و غم کا طوفان اُمڈ پڑا تھا۔ اب وہ جیل کی دیواروں، دروازوں، سلاخوں، پہرہ داروں کو غور سے دیکھنے لگے تھے۔ پہلے باہر کی دنیا کے ساتھ تخیل کا بلاواسطہ تعلق تھا اب اسے بھی جیل کی دیواریں پھاند کر آنا پڑتا تھا۔

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

اس شعر میں نسیم صبح وطن کی دیواروں کو پھاندنے کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی ہے اور اس کا ہجراں نصیب قیدی کو جیل والوں کی نظروں سے بچ کر یادوں کا تحفہ دینا اور اس کے آنسوؤں کی سوغات لے کر جانا بھی نظر آ رہا ہے۔

جب تک سوہنی کامیابی سے چناب کو عبور کر کے مہینوال کو مل لیا کرتی تھی۔ اس وقت تک اس کے ذہن میں چناب کی لہروں اور گھڑے کی پختگی کا ایک موہوم تصور تھا۔ اس کی ساری توجہ مہینوال پر مرکوز رہتی تھی کہ وہ کیسا ہوگا، کیسے ملے گا اور رخصت کے وقت دل پر کیا گزرے گی۔ جب وہ کچے گھڑے کی بدولت دریا میں ڈوبنے لگی، اس وقت نظریاں یار کی کٹیا پر تھیں۔ لیکن کوئی وقت ایسا ضرور آیا ہوگا، جب پوری شدت کے ساتھ اس کو دریا کی ہستی کا احساس ہوا ہوگا اور کچے گھڑے کی چکنی مٹی ہاتھوں میں محسوس کر کے پکا گھڑا ابھی یاد آیا ہوگا اور جب وہ مہینوال کی خاطر اپنی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہوگی تو ایک لمحے کے لیے مہینوال کا تصور بھی ذہن سے اتر گیا ہوگا۔ حیدر آباد کے قیام کے دوران میں فیض صاحب کا تصور باہر کی دنیا کے ساتھ بہت مضبوطی کے ساتھ جما رہا۔ جیل کی زندگی نے یہ رشتہ اور بھی مضبوط کر دیا تھا۔ دست صبا کے آخر میں فیض صاحب کی دو حسین و جمیل نظمیں زنداں کی ایک شام اور زنداں کی ایک صبح اس پر شاہد ہیں۔ یہاں انہوں نے زنداں کے کریہ المنظر دیو کی ہیبت ناکی کا پورا پورا نقشہ کھینچ دیا ہے۔ لیکن ان کے چہرے پر تحقیر آمیز مسکراہٹ ہے اور انہوں نے مسرت و شادمانی کے ایسے ذرائع نکال لیے ہیں، جو زنداں کے عفریت کے احاطہ قدرت سے باہر ہیں۔

دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے
کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمن جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنات گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں امید کے جلتے ہوئے تیر

کراچی کے قیام کے بعد یہ طلسم ٹوٹ گیا اور منٹگمری میں جیل اپنی پوری ہولناکیوں کے ساتھ روبرو آ گیا۔ چنانچہ ان کے درد دل نے دنیا بھر کے اسیروں کے رنج والم کو اپنے اندر سمو لیا تھا۔ کینیا کے باشندوں پر جمہوریت اور آزادی کے دعوے داروں کے ہاتھوں بے پناہ ظلم وستم اور ان کے اپنے وطن کے مصائب فیض صاحب کے لیے سوہان روح بنے ہوئے تھے۔ وہ افریقی عورتوں کے کارہائے نمایاں سے خاص طور پر متاثر تھے۔ کئی دفعہ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ پاکستانی نہیں رہے، افریقی بن گئے ہیں۔ ان کی نظم آجاؤ ایفریقا اس کی مظہر ہے۔

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے۔ روزنبرگ (Rosenberg) جوڑے کی بے مثال قربانی سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ یہاں وہ مرتے دم تک انسانیت کے مستقبل، انقلاب یا محبت یا ان سب کے ساتھ اپنی وفاداری جتلاتے رہتے ہیں۔ اس نظم کی آفاقیت (Universality) عجیب وغریب ہے۔ اس نے صدیوں کو پاٹ کر ہر زمانے اور ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے، ہر ملک کے شہیدوں کو ایک صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ یہ نظم کربلا، پلاسی ہرنگا پٹم، مدکی، جھانسی، جلیانوالہ، قصہ خوانی، سٹالن گراڈ، ملایا، کینیا، کوریا، تلنگانہ، مراکش، طیونس سبھی سے متعلق معلوم ہوتی ہے اور طہران، کراچی اور ڈھاکہ کی سڑکوں پر دم توڑے طلباء،

مراکش طیونس اور کینیا اور ملایا کے خون میں لت پت مجاہد، سب ایک ہی جانفروز نعرہ دہراتے سنائی دیتے ہیں

تیرے کوچے سے چھن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

ہم منٹگمری میں ہی تھے کہ ایرانی محبان وطن کو جیل میں گولی کا نشانہ بنانے کی مفصل روداد امریکی رسالہ ٹائم میں آئی۔ ساتھ ہی ان کی قتل گاہ میں لی گئی تصویر بھی تھی۔ سعدی اور حافظ کے وطن سے فیض صاحب کو خاص محبت ہے۔ کئی دن مضطرب رہے اور بالاخر ان کا اضطراب آخری رات کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ نظم ان خیالات وتصورات کی ترجمانی کرتی ہے قیدی کے ذہن میں اس رات گزرتے ہیں جس کی صبح کو اسے شہید ہونا ہوتا ہے۔ انسانیت کی راہ میں بہے ہوئے خون کے کرشمہ سازیاں دیکھیے، شہداء کہاں کہاں اور کس کس رنگ میں نئے روپ دھار لیتے ہیں

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جان دیگر است

فیض صاحب کی اس زمانے کے ذہنی کیفیت کی پوری پوری ترجمانی اگر کوئی نظم کرتی ہے وہ دریچہ ہے

منٹگمری سے دانتوں کے علاج کے سلسلے میں کوئی تین ہفتے کے لیے مارچ 1954ء میں ہمیں لاہور آنا پڑا۔ لاہور سے فیض صاحب کو والہانہ محبت ہے۔ وہ لاہور، آنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے دل پر بار گزرے گا۔ یہاں آ کر لاہور کا پانی پیا۔ اس کی فضا میں سانس لیا، لاہور کی آوازیں سنیں اور لاہور کے بعض

گاموں ماجھوں سے جو ختم نبوت تحریک کے سلسلے میں جیل میں آئے ہوئے تھے، ملاقات ہوئی اور اس کے دلدوز نظم اے روشنیوں کے شہر کا ظہور رہوا، جس پر کوئی شہر جتنا بھی فخر کرے بجا ہے۔

فیض صاحب کے دل میں لاہور اور لاہور والوں کی محبت کا جوش ایک دفعہ پہلے بھی اُمڈ پڑا تھا۔ جب 1953ء میں لاہور کے گلی کوچے اس کے فرزندوں کے خون سے رنگین ہو گئے تھے۔ لاہور کے نام ابھی تک ادھوری ہے۔

منٹگمری میں ان کی شاعری کے بارے میں میری اور ان کی کافی بحث و تمحیص ہوا کرتی تھی۔ میں کوئی نہ کوئی بات کہتا رہتا تھا اور ان کو جواب دیے بغیر چارہ نہ تھا۔ شاعر اور ماعر والا معاملہ تھا۔ راہ مفر ایک ہی تھی کہ سرکار کے آگے سر تسلیم خم کر کے مجھ سے نجات پاتے۔ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لہذا مرتا کیا نہ کرتا۔ آج کل بھی مذاقاً کہا کرتے ہیں کہ زنداں نامہ کے زنداں نامہ ہونے میں تمہاری وہابیت کا بھی دخل ہے۔

فیض کی جیل کی شاعری میں وطن کی محبت کے چشمے ہر طرف پھوٹ رہے ہیں۔ وہ جا بجا اپنے دیس اور اس کے باسیوں کی خستہ حالی، قوم کی عزت و ناموس کی ارزانی، لوگوں کی ناداری، جہالت، بھوک اور غم کو دیکھ دیکھ کر بے طرح تڑپ رہے ہیں۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

بعض دفعہ کچھ اور نہیں بنتا تو خیالی پلاؤ پکانے لگتے، اور جیل کی کال کوٹھڑی میں بیٹھ کر بھی گرد آلود، پریشاں حال لیلائے وطن کو بنا سنوار ادیکھنا چاہتے ہیں

بجھا جو روزن زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی

وطن کی محبت اس طرح ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی ہے کہ اب اس کا دوسری محبتوں سے علیحدہ کر کے دیکھنا ناممکن ہو گیا ہے۔

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائش منزل
رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں

زنداں میں نہ جانے کیا بات تھی کہ ہم سب کی حب وطن معمول سے زیادہ جوش پر تھی۔ صبح شام پاکستان کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ بے بسی نے مزاجوں میں چڑ چڑا پن پیدا کر دیا تھا۔ کبھی غضب ناک ہو جاتے تھے کبھی گریہ وزاری کو جی چاہتا تھا۔ دست و پا تو ناکارہ کر دیے گئے تھے لیکن دل و جاں پر آفت آئی ہوئی تھی۔

1951ء میں جب ہندوستان کے پاکستان کی طرف جارحانہ ارادوں کی خبریں شائع ہوئیں تو ہم میں سے ان افسروں نے جو ابھی تک معزول نہیں کیے گئے تھے، گورنمنٹ کو درخواست دی کہ پاکستان کی حفاظت میں ہم کو بھی جان لڑانے کی اجازت دی جائے، خاص طور پر جبکہ ہر ایک کو کشمیر میں ہندوستانی فوجوں سے لڑنے کا تجربہ ہے۔ درخواست میں واضح کر دیا گیا تھا کہ ہمارا مقصد مقدمے سے جان چھڑانے کا نہیں۔ ہم گورنمنٹ سے سوائے اس کے کچھ نہیں چاہتے تھے کہ ہنگامی حالات کے دوران میں مقدمے کو ملتوی کر دیا جائے۔ یہ کوئی سٹنٹ (Stunt) بھی نہیں تھا، اس لیے کہ ہمیں معلوم تھا کہ ہندوستانی فوجوں کے شانہ بشانہ ہندو

سبھائی اور اکالی درندے بھی ہوں گے اور مغربی پاکستان سے کوئی راہ مفر نہیں تھی۔ ہماری درخواست مسترد کر دی گئی۔ بہر حال زمانہ کھرے کھوٹے کی تمیز زود یا بدیر کر ہی لے گا۔

نظیری کاش بنمائی کہ در ساغر چہ می داری

کہ پیش زاہداں قدر گنہگاراں شود پیدا

ہندوستان اور پاکستان کا ذکر چل نکلا ہے۔ جیل میں فیض صاحب اکثر اپنے ہندوستانی دوستوں کو یاد کیا کرتے تھے۔ ان میں کئی ایک لاہور کے رہنے والے تھے۔ کئی دوسرے سالہا سال تک پنجاب میں رہ چکے تھے۔ مولانا حسرت موہانی، رشید جہاں، صاحب زادہ محمود الظفر، اسرار الحق مجاز، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، پنڈت ہری چند اختر، اپندر ناتھ اشک اور ان کی بیگم، ملک راج آنند، کرشن چندر، ڈاکٹر اشرف، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور دوسرے کئی اصحاب کا ذکر میں نے اتنی دفعہ سنا ہے کہ محسوس کرتا ہوں کہ ان کے ساتھ ایک عرصہ سے جان پہچان ہے، حالانکہ ان میں سے میں کسی ایک کو بھی ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ سجاد ظہیر اور فیض اکٹھے ہو جاتے تھے تو پھر باتیں ہی اکثر ان لوگوں کے بارے میں ہوا کرتی تھیں۔

1948ء کے فسادات کا زمانہ فیض صاحب نے لاہور میں گزارا تھا۔ انہی دنوں وہ مشرقی پنجاب بھی ہو آئے تھے۔ طرفین کے بہادروں اور سورمیروں نے جس طور پر انسانیت کو ذلیل کیا تھا، اس کا آنکھوں دیکھا حال اکثر سنایا کرتے تھے۔ بیان کرتے کرتے رقت طاری ہو جاتی اور رک جاتے۔ میرے خیال میں وہ اتنے بڑے پیمانے پر اس تفصیل سے اس ہولناک خانہ جنگی کو دیکھنے پر مجبور رہے ہیں کہ شعروں میں اس کو لانے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ وقت ملنے پر وہ ناول یا ڈرامے کے ذریعے پنجاب کی اس ٹریجڈی کو بیان کریں۔ پنجاب کی سرزمین یوں تو

ہزاروں سالوں سے حملہ آوروں کی تاخت وتاراج کا شکار رہی ہے۔ شاید ہی یہاں کی کوئی نسل ایسی گزری ہوگی جس نے غیر ملکی گھوڑوں کے سموں کی ٹاپ نہ سنی ہو۔ لیکن ان حملہ آوروں میں سے اکثر بگولے کی طرح آتے تھے اور آندھی کی طرح گزر جاتے تھے۔ تلوار کے سائے تلے جینے کی ذلت کچھ کم نہیں ہوتی، لیکن 1947ء میں جس طرح پنجابیوں نے پنجابیوں کو ذلیل وخوار کیا، تمام حملہ آوروں نے مل کر بھی نہیں کیا ہوگا۔ امرتا پریتم کے الفاظ میں

اج آکھاں وارث شاہ نوں کتوں قبراں وچوں بول
تے اج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول
اک روئی سی دھی پنجاب دی توں لکھ لکھ مارے وین
اج لکھاں دھیاں روندیاں تینوں وارث شاہ نوں کہن
اٹھ دردمنداں دیا دردیا، اٹھ تک اپنا پنجاب
اج بیلے لاشاں وچھیاں تے لہو دی بھری چناب
کسے نے پنجاں پانیاں وچ دتی زہر ملا
تے اونہاں پانیاں دھرت نوں دتا زہر پلا
دھرتی تے لہو وسیا قبراں پیاں چون
پریت دیاں شہزادیاں اج وچ مزاراں رون
اج سبھے کیدو بن گئے حسن عشق دے چور
اج کتھوں لیایئے لبھ کے وارث شاہ اک ہور

فیض صاحب پاکستان میں بعض اصحاب کے اس نظریے پر بہت رنجیدہ خاطر ہوا کرتے تھے کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق ہندوستان سے بھی ہے، پاکستان کے لیے زہر ہلاہل ہے۔ ریڈیو پر سوائے اقبال کے کلام کی قوالیوں اور فلمی گانوں کے کچھ سننے میں نہیں آتا۔ چنانچہ ہم جیل والوں سے بچ بچا کر، ہندوستانی ریڈیو سٹیشنوں سے

اپنے دیس کے راگ سنا کرتے تھے۔ کسی جاہل نے بزعم خود قومی جوش میں آ کر امیر خسرو، تان سین، واجد علی شاہ، عبدالکریم خان، فیاض خان اور دوسرے بیسوں اساتذہ اور زعماء سے پاکستان کا رشتہ توڑنے کو عین حب الوطنی سمجھ لیا تھا۔

ملکوں کی سیاسی و اقتصادی حدیں وقت کے تقاضوں کے مطابق بدلتی رہی ہیں۔ لیکن ایک خطہ زمین کے کلچر، زبان، ادب، آرٹ، موسیقی، فن تعمیر اور دوسری ثقافتی قدروں کا قوام سینکڑوں، ہزاروں سالوں کی ریاضت کے بعد تیار ہوتا ہے اور اس کی بنیادی ترکیب میں تبدیلی آسان نہیں ہوتی۔ پاکستان اور ہندوستان میں سیاسی دھینگا مشتی کیسی بھی صورت اختیار کر جائے دلی، لکھنو، حیدر آباد اور لاہور کی گنگا جمنی تہذیبیں اپنی جگہ قائم رہیں گی اور میر اور غالب میں سب کی سانجھ رہے گی۔ ہندوستانی اور پاکستانی تہذیبوں کے درختوں کی جڑیں موہنجوڈارو، گیا، ہرش پور، گندھارا، ٹیکسلا، متھرا، بنارس، اجنٹا، اجمیر، قطب مینار، تاج محل، جامع مسجد، شالا مار ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ شاخوں میں کہیں سمرقند و بخارا اور کہیں عرب و عجم سے آئے ہوئے پیوند اپنی بہار دکھا رہے ہیں اور کہیں پراچین ڈالیں جوں کی توں قائم ہیں۔ دوسرے کی ضد میں جڑوں کو نقصان پہنچانا یا شاخوں کی نوچ کھسوٹ کرنا اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنا ہے۔

فیض صاحب ان انسانیت نواز روایات سے تعلق رکھتے ہیں جو ہزاروں سالوں سے دونوں ملکوں کی سرزمین کا خاصہ رہی ہیں۔ وہ اسی سلسلے کی کڑی ہیں، جسے امیر خسرو، بھگت کبیر، خواجہ معین الدین چشتی، بابا نانک، بابا فرید، ابوالفضل، فیضی، بلھے شاہ، وارث شاہ، شاہ عبداللطیف بھٹائی، رحمان بابا اور دوسرے بہت سے بزرگوں نے فیض بخشا ہے۔

حیدر آباد میں ان کا درس و تدریس کا سلسلہ عجب متنوع قسم کا تھا۔ کوئی قرآن مجید اور حدیث شریف کا درس لے رہا ہے تو کوئی صوفیائے کرام کی تصانیف فتوح الغیب،

کشف المحجوب، احیاء العلوم وغیرہ کے رموز و نکات سمجھ رہا ہے۔ کوئی انگریزی اور یورپین ادب کی الجھنیں پیش کر رہا ہے تو کسی نے مارکسی جدلیاتی فلسفے پر بحث شروع کر رکھی ہے۔ اردو فارسی تو تکیہ کلام تھا۔ حیدر آباد میں ہم نے ان کو شاگرد کے رول میں بھی دیکھا ہے۔ پوشنی کے ساتھ مل کر سجاد ظہیر سے فرانسیسی زبان سیکھا کرتے تھے۔ نہایت غبی اور کام چور تھے۔ سید صاحب کی استادانہ گھرکیاں اور فیض صاحب کی بہانہ سازیاں بہت لطف پیدا کرتی تھیں۔

محنت کشوں سے انہیں خاص الفت ہے۔ حیدر آباد میں ایک بار ہمارے احاطے میں بجلی کے کھمبے کا فیوز (Fuse) جل گیا۔ ایک مستری بغیر سیڑھی کے وہاں پہنچ گیا۔ ہم تلملانے لگے کہ خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ اس نے کھمبے کو ذرا ٹھونکا بجایا اور یہ جا وہ جا۔ بغیر سیڑھی کے کھمبے کے سرے تک پہنچ کر آنکھ جھپکنے میں نیا فیوز لگا آیا۔ فیض صاحب دیر تک اس کے قصیدے پڑھتے رہے۔ منٹگمری میں شاہ جی ایک پوسٹ مین، ہمارے پارسل وغیرہ لایا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر فیض صاحب کی آنکھوں میں جس قسم کی روشنی آ جایا کرتی تھی وہ میں نے کم ہی دیکھی ہے۔ دونوں ٹریڈ یونین کے ممبر رہ چکے تھے۔ کہا کرتے ہیں کہ ہندوستان پاکستان کے مسائل کا حل ایک ہی ہے کہ دونوں ملکوں میں محنت کش اپنے حقوق حاصل کر کے اپنے اپنے چمنستانوں کے والی بن جائیں۔ اس کے بعد ان ملکوں کے درمیان نفرت کا زہر اور اس کو پیدا کرنے والے حل طلب مسائل، جن کی آڑ میں سامراجی آج کل اپنے آہنی پنجے وطن عزیز کی رگوں میں دوبارہ پیوست کر رہے ہیں، یوں غائب ہو جائیں گے جیسے دیووں پریوں کے قصوں میں ہیرو کے اسم پڑھنے پر دیو بھوت اور دوسری بلائیں آناً فاناً رفع دفع ہو جاتی ہیں۔

فیض کی شاعری میں ایک صاحب دل کا جوش اور ولولہ ہے۔ اس میں قوم کی قوم کا دل دھڑک رہا ہے۔ لیکن شاید کیا بات کہ اس کے قوام میں پاکستان کے محنت

کشوں کا مبارک پسینہ اور خون کی حرارت ابھی تک پوری مقدار میں شامل نہیں ہیں۔ سمن و گلاب کو جس چاہت سے یاد کیا ہے۔ اسی چاہت اور تفصیل سے اس بد حال بد نصیب کا ذکر نہیں ہے، جس نے سمن و گلاب کو اپنے خون جگر سے سینچ کر شاداب کیا ہے اور جس کو حق پہنچتا ہے کہ وہ بھی ان سمن و گلاب کی نزاکتوں، رنگ روپ اور عطر بیزیوں سے مستفید ہو سکے۔ ان کا دل تو ادھر کھنچا جا رہا ہے لیکن

لغزش پا میں ہے پابندی آداب ابھی

ان کی شاعری کو ڈرائنگ روموں، سکولوں، کالجوں سے نکل کر سڑکوں بازاروں، کھیتوں اور کارخانوں میں ابھی پھیلنا ہے۔

وہ کہا کرتے تھے کہ یہ چیز صرف پنجابی میں ہو سکتی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں یہ ان کی معمول کے مطابق کسر نفسی ہے اور جبلی ہچکچاہٹ دست صبا کے ابتدائیہ میں انہوں نے فرمایا ہے یوں کہئے کہ شاعر کا کام صرف مشاہدہ ہی نہیں، مجاہد بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اس کو دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا، اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں آگے فرمایا ہے کہ حیات انسانی کی اجتماعی جدوجہد کا ادراک اور جدوجہد میں حسب توفیق شرکت زندگی کا تقاضا ہی نہیں فن کا بھی تقاضا ہے۔ زنداں نامہ اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ فیض صاحب کے مشاہدہ اور مجاہدہ کے تناسب میں مجاہدہ کا پلڑا بھاری ہو رہا ہے اور یہی اس وقت ان کے فن کے تقاضا بھی معلوم ہوتا ہے۔

اب ان کی نظریں لاہور کے مناظر سے اٹھ کر پاکستان کے وسیع میدانوں پر پڑنے لگی ہیں۔ جہاں بے شمار انسان نما مٹی کے تودے صدیوں سے ایک ہی طرح کی دھیمی دھیمی حرکت کر رہے ہیں۔ اب ان تودوں کی کمریں کچھ سیدھی ہو رہی ہیں ان کو اس بوجھ کا احساس ہو رہا ہے جو انہوں نے قرنوں سے اٹھا رکھا ہے۔ کیونکہ ان

پر آہستہ آہستہ یہ بھید کھل رہا ہے کہ بعض دوسرے دیسوں میں ان کے بھائی بندوں نے یہ بوجھ اتار دیا ہے اور وہ لوگ اب انسانی عظمت میں برابر کے یک ہیں۔ ان کی آنکھوں میں ایک طرح کا نور ہے، کیونکہ وہ دور افق پر زندگی اور توانائی کی اٹھتی، گرتی، گھٹتی، بڑھتی روشنی دیکھ رہے ہیں۔ لیکن یہ لوگ کسی برہا کی ماری کی طرح جو اچانک اپنے پریتم کو نزدیک آتا دیکھے، ابھی تک لجا رہے ہیں، شرما رہے ہیں اور اپنی کم مائگی اور پریشان حالی کو چھپانا چاہتے ہیں۔ فیض صاحب کی نظریں کارخانوں میں بھی گھس رہی ہیں، جہاں کسانوں کے ساتھی مزدور انسان کی تخلیقی قوت اور اس کی عظمت کا درس حاصل کر رہے ہیں۔ فیض یہ سب کچھ خود ہی نہیں دیکھ رہے اپنے لاہوری بھائی بندوں، دماغی مزدوری کرنے والے مصنفوں، کلرکوں، چھوٹے دکانداروں، وکیلوں، ٹیچروں، طالب علموں، گاموں اور ماجھوں کو بھی دکھلا رہے ہیں اور پکار رہے ہیں کہ کارگہِ ہستی میں جورن پڑ رہا ہے، اس میں حق و باطل کے لشکروں کو پچانو ناداری، دفتر، بھوک اور غم نے چومکھ پتھراؤ کر کے تمہارے ساغر دل کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور تمہاری عزت اور ناموس خاک میں ملا دی ہے۔

صہبائے غم جاناں کی پری کی بے حرمتی کر دی ہے لیکن

یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اک بخیہ ادھیڑا ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے

اس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر شیشے ڈھلتے ہیں
ہر شے کا بدل مل سکتا ہے

سب دامن پر ہو سکتے ہیں

اب لوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں

کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکائے پھرتے ہیں
ہر پربت کو ہر گو ہر کو
نیلام چڑھائے پھرتے ہیں

کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اٹھائی گیروں کی
ہر چال الجھائے جاتے ہیں

ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی نگر نگر
ہر بستے گھر کیت سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر

یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے پھرتے ہیں
یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے پھرتے ہیں

سب ساغر شیشے لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اس دن سے بلاوے آتے ہیں

زنداں نامہ میں فیض صاحب نے حق و باطل کی اس ہولناک جنگ میں بہادروں کی بہادری کے واقعات کا تذکرہ شروع کر دیا ہے۔ اس کی ابتدا وہ دست صبا میں ایرانی طلبہ کے نام لکھ کر کر چکے ہیں۔ لیکن ابھی تک ان کی یہ عادت پوری طرح نہیں کی گئی کہ وہ آتش فشاں پہاڑ کے دھوئیں کے پہلے مرغولہ (Puff) کو ہی لے بیٹھتے ہیں۔ اور جب یہ دھواں ہوا کے جھونکوں سے چشم زدن میں تتر بتر ہو جاتا ہے تو رنجیدہ خاطر ہو جاتے ہیں یا طوفان کی پہلی موج میں ہی محو تماشا ہو جاتے ہیں اور جب اسے ساحل کی ریتی میں جذب ہوتا دیکھتے ہیں تو فرط درد سے بے حال ہو جاتے ہیں یا بڑھتے ہوئے لشکر کے سب سے اگلے سکاوٹ جب کھیت ہو جاتے ہیں تو ان کو تڑپتا دیکھ کر تمام نظام کائنات کو آگ لگا دینا چاہتے ہیں۔ ایسے درد کی فراوانی ہر نیک دل کا خاصہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر آتش فشاں کی زمیں دوز گرج کو سنا جائے اور اس کے چند لمحوں میں ابلنے والے کروڑوں من لاوا کا تصور کیا جائے یا پہلی لہر کے پیچھے بھرے ہوئے بے کنار سمندر کا خیال کیا جائے تو دھوئیں کے پہلے مرغولہ کے

بکھرنے طوفان کی پہلی لہر کے جذب ہو جانے اور سکاؤٹوں کے مرنے میں دردوغم کی جگہ مجاہدانہ تڑپ آ جاتی ہے۔ زندگی کے سائے گہرے ہونے کی بجائے اس کی رنگینیوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان تینوں کی موت پر رونے دھونے کی بجائے ان کی یادگار منانے کو جی چاہتا ہے۔ وہ عشق و محبت کے پہلے کشتے ہی نہیں فتح کے بانی بھی ہیں اور ان کی موت زندگی کا رس ہے۔ فیض صاحب کا کینوس ذرا اور وسیع ہو جائے تو بلاشبہ ہمارے گورکی بن جائیں گے۔ ان سے زیادہ اس رتبہ کا اور کون مستحق ہے۔ بدقسمتی سے حالات کچھ ایسے ہیں کہ ان میں رجز خوان ایک جان کے ساتھ کیا کچھ کر سکتا ہے۔

منٹگمری میں میری ایک ڈیوٹی فیض صاحب کے لیے سامعین فراہم کرنا تھی اس کا ایک ذریعہ یہ تھا کہ میں ان کا تازہ کلام سید سجاد ظہیر صاحب کو مچھ جیل میں اور عطا اور پوشنی کو حیدرآباد بھیج دیا کرتا تھا۔ سید سجاد ظہیر کے ایک خط کا اقتباس اس مضمون کے اختتام کے لیے بہت مناسب رہے گا۔

سنٹرل جیل، مچھ بلوچستان 21 فروری 54ء

آئندہ میں زیادہ باقاعدگی سے تمہارے خطوں کا جواب دوں گا۔ اس ارادے میں صرف اخلاقی فرض ہی کا تقاضا نہیں بلکہ میری خودغرضی بھی شامل ہے۔ تمہارے خطوں سے دوستی اور التفات کی لطیف مہک آتی ہے۔ جس سے رنجور دل کو بے انتہا ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ اس طرح ہم تنہائی میں گفتگو کر لیتے ہیں۔ تھوڑی بہت فلسفیانہ اور ادبی موشگافیاں کر لیتے ہیں اور آہنی دیواروں میں کسی قدر رخنہ ڈال کر جیسے نکلتے ہوئے سورج کی کرنوں سے ذرا دیر کے لیے دل و دماغ کو منور کر لیتے ہیں پھر اس کے علاوہ تم فیض کے کلام کے تحفے بھی بھیجتے ہو اور اب کی بار تو تم نے اس کے انبار لگا دیے ہیں، ان کے لیے فیض اور تمہارا بہت بہت شکریہ یہ تو ایسا عطیہ ہے جس کا عوض مجھ سے کبھی ادا نہیں ہو سکتا۔

فیض صاحب کی نظم ملاقات مجھے پسند آئی اس میں علائم کی مرضع نگاری اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے اور پہلے مصرع سے شروع ہو کر (یہ رات اس درد کا شجر ہے) نظم کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کے جیسے نازک پھول چاروں طرف کھلتے چلے گئے ہیں۔ جن میں ہر ایک ایسا ہے جو اپنی جداگانہ خوشبو اور رنگ بھی رکھتا ہے اور دوسروں کے ساتھ ہم آہنگ اور متوازن بھی ہے، پھر نظم کا بنیادی خیال پوری تخیل کے ساتھ بڑی کامیابی سے ملایا گیا ہے، جیسے ایک حسین اور نازک جسم میں دردمند، حساس اور لطیف روح ہو۔ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ محن، غمناکی، شدت درد اور ان سب کے باوجود، بلکہ ان کے وسیلے سے نمودار ہونے والی نئی سحر کے تصور کو گرفت میں لانے کے بعد شاعر نے اسے نظم کا جامہ پہنایا ہے، بلکہ یہاں پر یہ بلند ہمت آور خیال اور تصور جیسے شاعرانہ تخیل کا ثمر ہے اور پوری نظم کے گلدستے سے دل آویز اور روح افزا رنگینیوں اور نکہتوں کے ساتھ جھک پڑا ہے، تیسرے بند کے شروع کے چار مصرعے، جہاں سے گریز کیا گیا ہے، اپنی فصاحت، موسیقیت، روانی اور زور کلام کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ انہیں ایک بار پڑھ لو تو دل پر نقش ہو جاتے ہیں اور پھر بھولتے نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اتوار کی صبح کو کسی کلیسا کی گھنٹیاں لہک لہک کر بج رہی ہوں اور ان کی مسلسل آواز صرف سامعہ میں نہیں بلکہ سارے جسم کے پوروں میں سرایت کر رہی ہو۔ فیض کی شاعری کا رنگ لوگ جس بات کو کہتے ہیں اس میں لہجے کی دردناکی اور فضا کی نرمی ایک چیز ہے۔ مجھے اس کی خوشی ہے کہ ان مصرعوں میں وہ رنگ نہیں ہے۔ اچھے اور بڑے شاعر اپنا رنگ ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں گو وہ اپنی فطرت نہیں بدل سکتے۔

تم نے اپنے گزشتہ خط میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا کہ اب انہیں ہمت کر کے ایک جست لگانی چاہیے، تاکہ ان کی شاعری میں خوشبوؤں اور گل بیزیوں کے علاوہ

خلق خدا کے اس مبارک پسینے اور خون کی حرارت کی آمیزش بھی ہو، جس سے فی الحقیقت زندگی بنتی، بدلتی اور سنورتی ہے۔ میں اس خیال سے بالکل متفق ہوں۔ البتہ میں انہیں ایسا کرنے کے لیے دھکا نہیں دینا چاہتا ان امید افزا اعلا ماقات کے سبب سے جو حالیہ نظموں اور غزلوں میں خود ہی نظر آ رہی ہیں، جو کہ صحیح جمہوری سمت کا پتہ دیتی ہیں۔

میرے خیال میں وہ خود اس نکتہ کو سمجھتے ہیں۔ پنجاب کی سرزمین صدیوں پہلے بابا فرید، وارث شاہ، بلھے شاہ کی ذاتوں میں دوسرے حالات اور دوسرے ماحول میں ایسی جمہورے شاعری پیدا کر چکی ہے، ہمارے یہاں کبیر، تلسی، سور ہو چکے ہیں، ایسے نغمے پھر کیوں نہیں چھیڑے جا سکتے۔

ان نئی غزلوں پر ان کو مبارک باد دینا، گو یہ صحیح ہے کہ داد مرزا جعفر علی خان سے ہی لینا چاہیے۔ میں تو اب برائے نام لکھنو کا رہ گیا ہوں۔ چھ سال پنجاب میں اور پنجابیوں کے ساتھ رہ کر اللہ ہی جانتا ہے کہ زبان کتنی بگڑ گئی ہے۔ شاید چونکہ موسم بہار کا ہے۔ اس لیے ہمیں گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے والی غزل سب سے اچھی لگی۔ اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی

بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جس غزل کو تم نے واسوخت کا عنوان دیا ہے وہ بھی اپنے رنگ میں خوب ہے۔ ایک ایک شعر نشتر ہے۔ کس کس کی تعریف کریں۔ خاص طور پر یہ شعر

گر فکر زخم کی تو خطا کار ہیں کہ ہم
کیوں محو مدح خوبی تیغ ادا نہ تھے

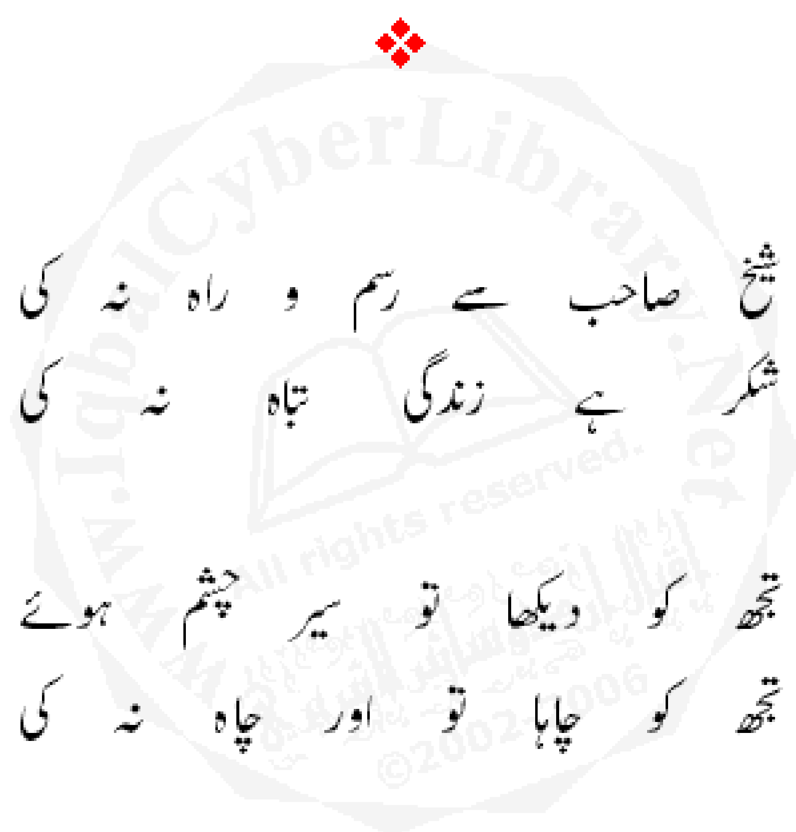
اس کی داد تو فیض مرزا نوشہ سے بھی لے لیتے۔ جعفر علی خان اثر تو الگ رہے۔

☆☆☆

اے ساکنانِ کنجِ قفس! صبح کو صبا
سنتی ہی جائے گی سوئے گلزار، کچھ کہو!

(سودا)





شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

تھے شبِ ہجر، کام اور بہت
ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیض
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

☆☆☆

❖

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخرو ہیں کہ منزل سے آئے ہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں، تری محفل سے آئے ہیں

اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

بادِ خزاں کا شکر کرو، فیضؔ، جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں

حبیب عنبر دست!

ایک اجنبی خاتون کے نام
خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر

کسی کے دست عنایت نے کنج زنداں میں
کیا ہے آج عجب دل نواز بندوبست
جھک رہی ہے فضا زلف یار کی صورت
ہوا ہے گرمی خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گل بدن گویا
کہیں قریب سے، گیسو بدوش، غنچہ بدست

لیے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست
ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست

یہ شعر حافظ شیراز، اے صبا! کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیب عنبر دست
خلل پذیر بود ہر بنا کہ مے بینی

بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

سنٹرل جیل حیدرآباد

۲۸،۲۹،اپریل ۵۳ء

❖

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

کرے کوئی تیغ کا نظارا، اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیِ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے، ادھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں، اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

حیدرآباد جیل

ے۱،۲۲، مئی ۵۴ء

شام فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

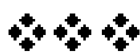
بزم خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

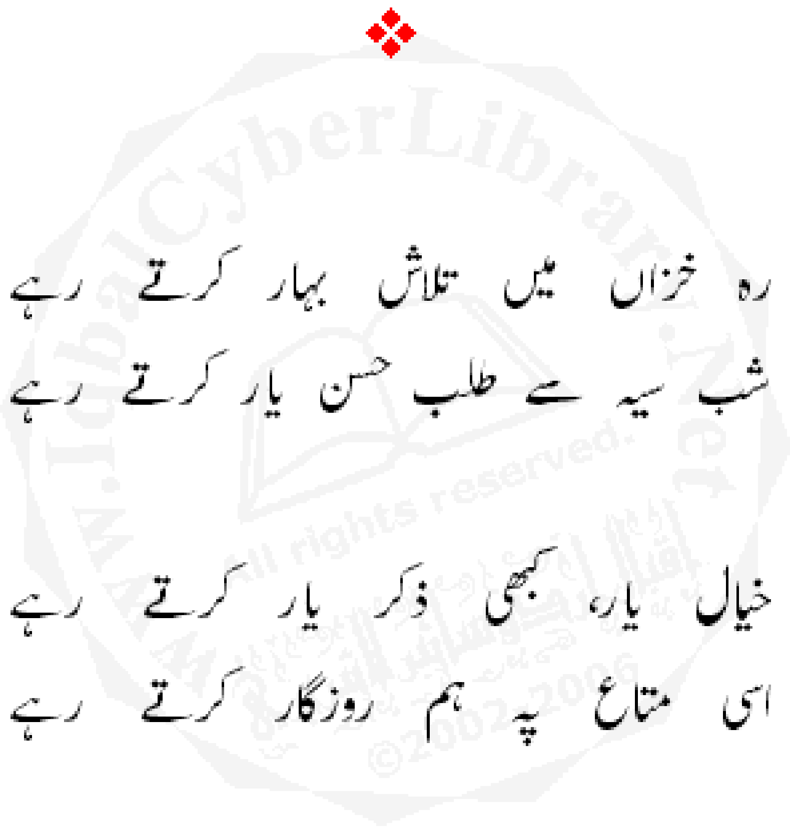
دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخر شب کے ہم سفر فیض نجانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

جولائی ۵۳ء　　　جناح ہسپتال کراچی



❖



رہ خزاں میں تلاش بہار کرتے رہے
شب سیہ سے طلب حسن یار کرتے رہے

خیال یار، کبھی ذکر یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

نہیں شکایت ہجراں کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتہ دل استوار کرتے رہے

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سخن رازدار کرتے رہے

ضیائے بزم جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیث شعلہ رخاں بار بار کرتے رہے

انہیں کے فیض سے بازار عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جنوں اختیار کرتے رہے

جناح ہسپتال کراچی

۲۱، اگست، ۵۳ء

ملاقات

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نور، رو گئے ہیں
یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے

گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے، ہیرے پرو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اسی کے سائے میں نور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سلگ رہا ہے
(وہ غم، جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے

ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

(۳)

الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح، افلاک پر نہیں ہے
جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن افق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر

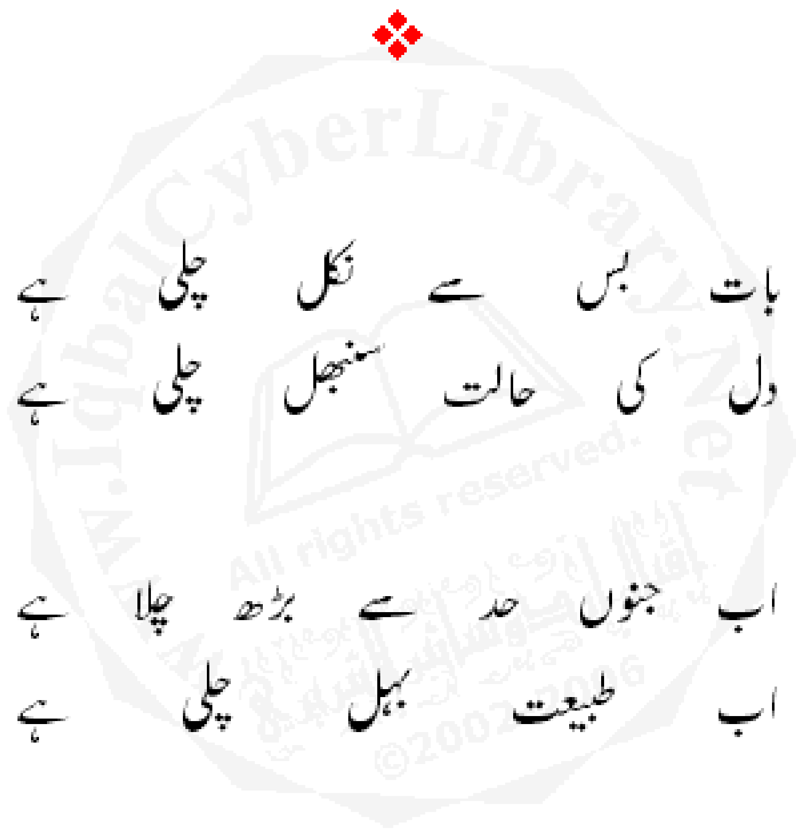
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقین جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

منٹگمری جیل

۱۲، اکتوبر، ۳، نومبر ۵۳ء

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں





بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے

اب جنوں حد سے بڑھ چلا ہے
اب طبیعت بہل چلی ہے

اشک خوناب ہو چلے ہیں
غم کی رنگت بدل چلی ہے

یا یونہی بجھ رہی ہیں شمعیں
یا شبِ ہجر ٹل چلی ہے

لاکھ پیغام ہو گئے ہیں
جب صبا ایک پل چلی ہے

جاؤ اب سو رہو ستارو
درد کی رات ڈھل چلی ہے

منٹگمری جیل

۲۱، نومبر ۵۳ء



واسوخت

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ہاں، جو جفا بھی آپ نے کی، قاعدے سے کی!
ہاں، ہم ہی کار بند اصول وفا نہ تھے

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

کیوں داد غم، ہمیں نے طلب کی، برا کیا
ہم سے جہاں میں گشتۂ غم اور کیا نہ تھے

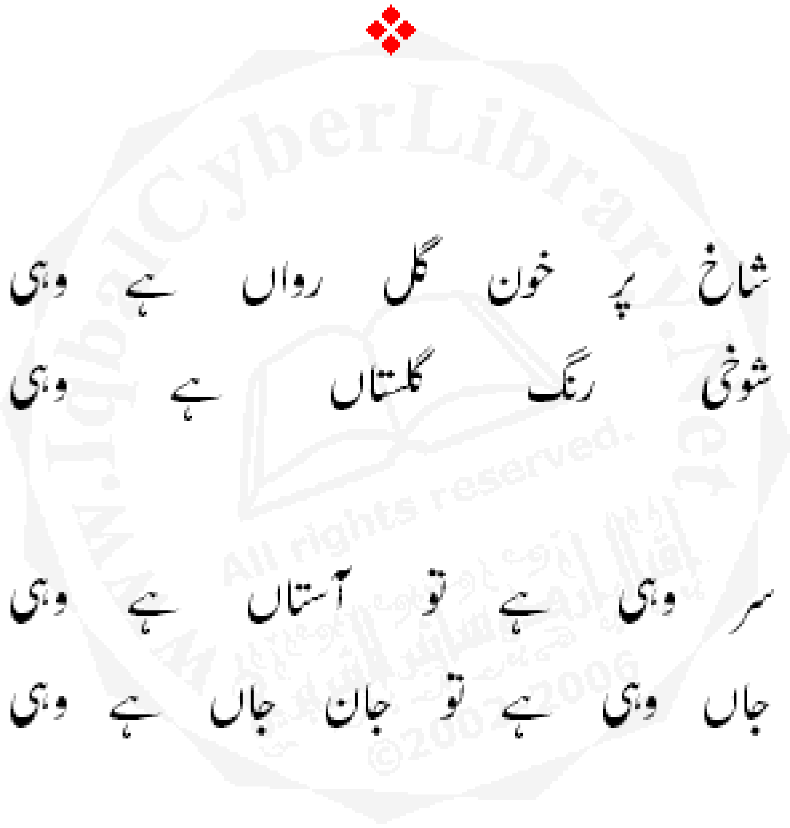
گر فکر زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
کیوں محو مدح خوبی تیغ ادا نہ تھے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھا، بہت لا دوا نہ تھے

لب پہ ہے تلخیء مئے ایام، ورنہ فیض
ہم تلخیء کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

منٹگمری جیل،
۲۴، نومبر ۵۳ء





شاخ پر خون گل رواں ہے وہی
شوخی رنگ گلستاں ہے وہی

سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جان جاں ہے وہی

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچہء یار مہرباں ہے وہی

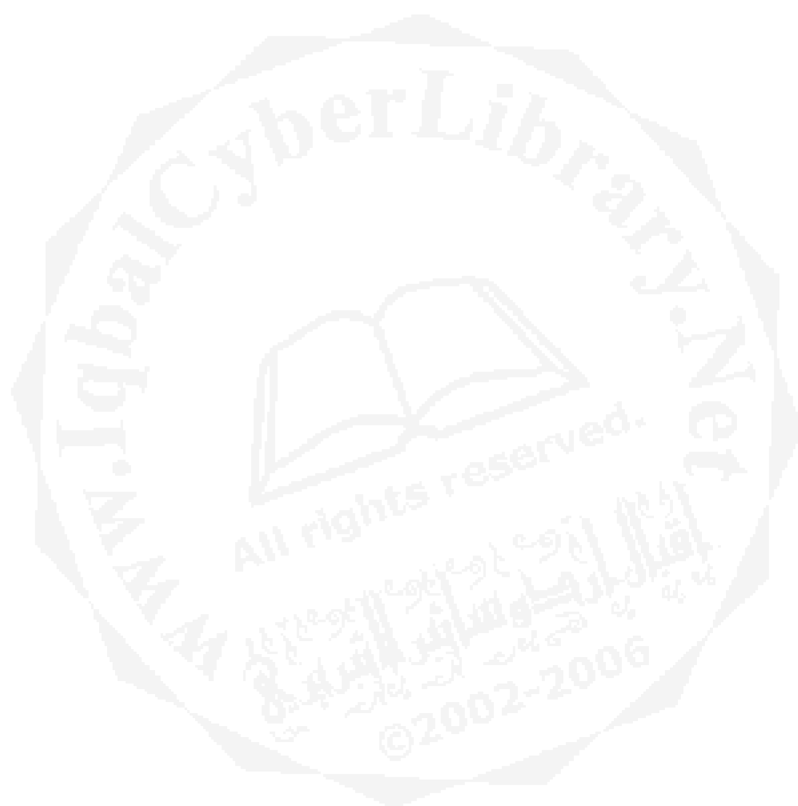
برق سو بار گر کے خاک ہوئی
رونق خاک آشیاں ہے وہی

آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی

چاند تارے ادھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

منٹگمری جیل

۲۴،نومبر،۵۳ء



❖

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدان وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

منٹگمری جیل

❖

ہم پر تمھاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جرم تو نہیں
شوقِ فضول و الفتِ ناکام ہی تو ہے

دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

بھیگی ہے رات فیض غزل ابتدا کرو
وقت سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

منٹگمری جیل

۹ مارچ ۵۴ء

❖❖❖

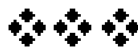
اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ، سوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں، اونچی رکھیں لو

لاہور جیل ۲۸ مارچ
منٹگمری جیل ۔ ۱۵ اپریل ۵۴ء



گلوں میں رنگ بھرے باد نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنج لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سر کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضور یار ہوئی دفتر جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام، فیض، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

منٹگمری جیل

۲۹ جنوری ۵۴ء

❖❖❖

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے
خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

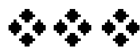
نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی،
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے

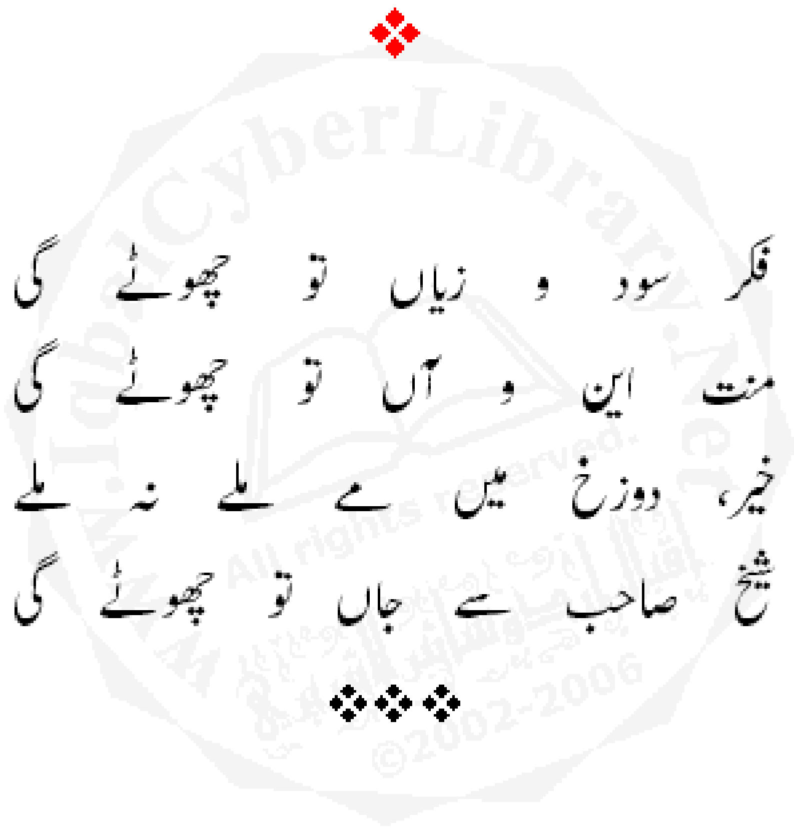
کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

منٹگمری جیل

۱۵ مئی ۵۴ء



❖



فکر سود و زیاں تو چھوٹے گی
منت این و آں تو چھوٹے گی
خیر، دوزخ میں مے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

❖❖❖



کچھ محتسبوں کی خلوت میں، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی، اب جام میں کمتر جاتی ہے

یوں عرض و طلب سے کب اے دل، پتھر دل پانی ہوتے ہیں
تم لاکھ رضا کی خو ڈالو، کب خوئے ستمگر جاتی ہے

بیدادگروں کی بستی ہے یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں فریاد جو در در جاتی ہے

ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

اب کوچۂ دلبر کا رہرو، رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں اور رات برابر جاتی ہے

ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

منٹگمری جیل

۱۷، جون ۵۴ء





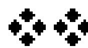
دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لیے
ہر ایک وصل خداوند کی امنگ لیے

کسی پہ کرتے ہیں ابر بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دو نیم
کسی پہ باد صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگان مہرو جمال
لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں
اور آئے دن مری نظروں کے سامنے ان کے
شہید جسم سلامت اٹھائے جاتے ہیں

منٹگمری جیل
دسمبر ۵۴ء

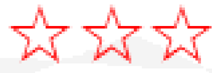


درد آئے گا دبے پاؤں ....

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں، لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے

شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اٹھے گا

حلقۂ زلف کہیں، گوشۂ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں



دل سے پھر ہوگی مرے بات کہ اے دل اے دل

یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا

یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا

اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہو گا

مشتعل ہو کے ابھی اٹھیں گے وحشی سائے

یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے

رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہو گا

جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل

دشمن جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل

یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی

درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل

لاؤ، سلگاؤ کوئی جوش غضب کا انگار

طیش کی آتش جرار کہاں ہے لاؤ

وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے لاؤ

جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر

منتظر ہو گا اندھیرے کی فصیلوں کے ادھر

ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے

خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے

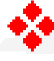
دور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

منٹگمری جیل

یکم دسمبر ۵۴ء



❖❖❖



صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگ رخسار کی پھوہار گری
رات چھائی تو روئے عالم پر
تیری زلفوں کی آبشار گری

AFRICA COME BACK

(ایک رجز)

آ جاؤ، میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آ جاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال
’’آ جاؤ ایفریقا‘‘
آ جاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آ جاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آ جاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آ جاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
’’آ جاؤ ایفریقا‘‘
پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال
’’آ جاؤ ایفریقا‘‘

افریقہ حریت پسندوں کا نعرہ

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین
دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال
’’آ جاؤ ایفریقا‘‘
دھرتی دھڑک رہی ہے مرے ساتھ ایفریقا

دریا تھرک رہا ہے تو بن دے رہا ہے تال
میں افریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا روپ
میں تو ہوں، میری چال ہے تیری بر کی چال
'آ جاؤ افریقا'
آؤ بر کی چال
'آ جاؤ افریقا'

منٹگمری جیل

۱۴ جنوری ۵۵ء

❖❖❖

گرمی شوق نظارا کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایہ در تو دیکھو

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پند گرو، راہ گزر تو دیکھو

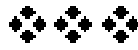
وہ تو وہ ہے، تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

وہ جو اب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو

دامن درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دل پر خوں کا ہنر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شب غم کا افق
فیض، تابندگی دیدہ تر تو دیکھو

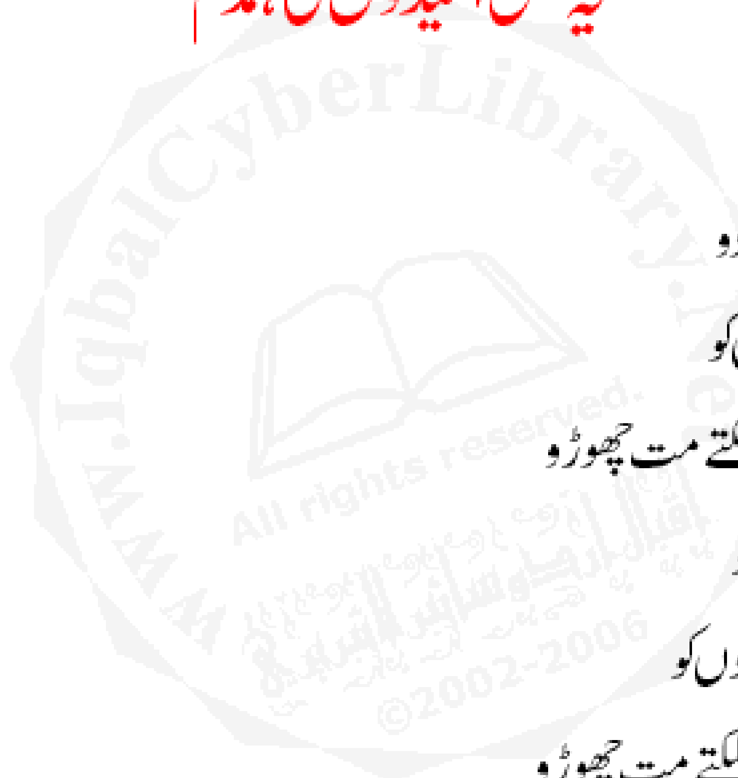
منٹگمری جیل


۴، مارچ ۵۷ء

❖❖❖



یہ فصل امیدوں کی ہمدم



سب کاٹ دو
بسمل پودوں کو
بے آب سسکتے مت چھوڑو
سب نوچ لو
بے کل پھولوں کو
شاخوں پہ بلکتے مت چھوڑو
یہ فصل امیدوں کی ہمدم
اس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت، صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی
کھیتی کے کونوں، کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رت کی فکر کرو

پھر اگلی رت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا

جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

منٹگمری جیل

۳۰ مارچ ۵۵ء

❖❖❖

بنیاد کچھ تو ہو

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو، کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا
رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو

خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو
گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

منٹگمری جیل

۱۳،اپریل ۵۵ء



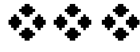
کوئی عاشق کسی محبوبہ سے!

یاد کی راہ گزر جس پہ اسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشت فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں نہ کوئی تم ہو
سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ، یا مڑ کر دیکھو

گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب دھوکا ہے
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر
پھوٹ نکلے گی وہاں اور کوئی راہ گزر
پھر اسی طرح جہاں ہو گا مقابل پیہم
سایہ زلف کا اور جنبش بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھوٹی ہے کہ دل جانتا ہے
یاں کوئی موڑ کوئی دشت کوئی گھات نہیں
جس کے پردے میں مرا ماہ رواں ڈوب سکے
تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے

تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں





اگست ۵۵ء

شہر میں چاک گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے

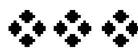
لطف کر، اے نگہ یار، کہ غم والوں نے
حسرت دل کی اٹھائی نہیں تمہید اب کے

چاند دیکھا تری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پر شفق
ملتی جلتی ہے شب غم سے تری دید اب کے

دل دکھا ہے نہ وہ پہلا سا نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے

پھر سے بجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سر محفل کوئی خورشید اب کے

کراچی ۱۴، اگست ۵۵ء



یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کوچہ یار سے بے نیل مرام آتا ہے

ہر کوئی شہر میں پھرتا ہے سلامت دامن
رند میخانے سے شائستہ خرام آتا ہے

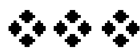
ہوس مطرب و ساقی میں پریشاں اکثر
ابر آتا ہے کبھی ماہ تمام آتا ہے

شوق والوں کی حزیں محفل شب میں اب بھی
آمد صبح کی صورت ترا نام آتا ہے

اب بھی اعلان سحر کرتا ہوا مست کوئی
داغ دل کر کے فروزاں سر شام آتا ہے

ناتمام

لاہور مارچ ۵۶ء



تمام شب دل وحشی تلاش کرتا ہے
ہر اک صدا میں ترے حرف لطف کا آہنگ
ہر ایک صبح ملاتی ہے بار بار نظر
ترے دہن سے ہر اک لالہ و گلاب کا رنگ

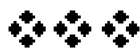


❖

تمہارے حسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر
تمہاری یاد سے دلم ہم کلام رہتا ہے
رہی فراغت ہجراں تو ہو رہے گا طے
تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

حیدرآباد جیل

۱۹۵۱ء



کھلے جو ایک دریچے میں آج حسن کے پھول
تو صبح جھوم کے گلزار ہو گئی یکسر
جہاں کہیں بھی گرا نور ان نگاہوں سے
ہر ایک چیز طرحدار ہو گئی یکسر

جناح ہسپتال کراچی



صبح کی آج جو رنگت ہے وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سر گلزار ہے کون

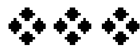
شام گلنار ہوئی جاتی ہے دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لیے مشعل رخسار، ہے کون

رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے پوچھو
آج بکھرائے ہوئے زلف طرح دار ہے کون

پھر در دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک
جانے پھر دل وحشی کا طلب گار ہے کون

جناح ہسپتال کراچی

جولائی ۵۳ء



تری امید، ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت، نہ دن کو شب سے ہے

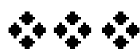
کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ہوا ہے جب سے دل ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب، تیرے رنگ لب سے ہے

کہاں گئے شب فرقت کے جاگنے والے
ستارہ سحری ہم کلام کب سے ہے

لاہور مارچ ۵۷ء





رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دل عشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

دست تہ سنگ

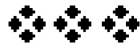


انتساب

دیس پردیس کے یاران قدح خوار کے نام
حسن آفاق، جمال لب و رخسار کے نام

سرآغاز

شاید کبھی افشا ہو، نگاہوں پہ تمہاری
ہر سادہ ورق، جس سخن کشتہ سے خوں ہے
شاید کبھی اس گیت کا پرچم ہو سر افراز
جو آمدِ صرصر کی تمنا میں نگوں ہے
شاید کبھی اس دل کی کوئی رگ تمہیں چبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کی مانند زبوں ہے



تقریر

فیض صاحب کی تقریر جوانہوں نے ماسکو میں بین الاقوامی

لینن امن انعام کی پرشکوہ تقریب کے موقع پر اردو بان میں کی

محترم اراکین مجلس صدارت، خواتین اور حضرات!

الفاظ کی تخلیق و ترتیب شاعر اور ادیب کا پیشہ ہے لیکن زندگی میں بعض مواقع ایسے بھی آتے ہیں جب یہ قدرت کلام جواب دے جاتی ہے۔ آج عجز بیان کا ایسا ہی مرحلہ مجھے درپیش ہے۔ ایسے کوئی الفاظ میرے ذہن میں نہیں آ رہے، جن میں اپنی عزت افزائی کے لیے لینن پرائز کمیٹی، سوویٹ یونین کے مختلف اداروں، دوستوں اور سب خواتین اور حضرات کا شکریہ خاطر خواہ طور سے ادا کر سکوں۔ لینن امن انعام کی عظمت تو اسی ایک بات سے واضح ہے کہ اس سے لینن کا محترم نام اور مقدس لفظ وابستہ ہے۔ لینن جو دور حاضر میں انسانی حریت کا سب سے بزرگ علم بردار ہے اور امن جو انسانی زندگی اور اس زندگی کے حسن و خوبی کی شرط اول ہے۔ مجھے اپنی تحریر و عمل میں ایسا کوئی کام نظر نہیں آتا جو اس عظیم اعزاز کے شایان شان ہو۔ لیکن اس عزت بخشی کی ایک وجہ ضرور ذہن میں آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس تمنا اور آدرش کے ساتھ مجھے اور میرے ساتھیوں کو وابستگی رہی ہے یعنی امن اور آزادی کی تمنا وہ بجائے خود اتنی عظیم ہے کہ اس واسطے سے ان کے حقیر اور ادنیٰ کارکن بھی عزت اور اکرام کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

یوں تو ذہنی طور سے مجنون اور جرائم پیشہ لوگوں کے علاوہ سبھی مانتے ہیں کہ امن اور آزادی بہت حسین اور تابناک چیز ہے اور سبھی تصور کر سکتے ہیں کہ امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا قلم ہے اور مصور کے موئے قلم اور آزادی ان سب صفات کی ضامن اور غلامی ان سب خوبیوں کی قاتل ہے جو انسان اور حیوان میں تمیز کرتی ہے۔ یعنی شعور

اور ذہانت، انصاف اور صداقت، وقار اور شجاعت، نیکی اور رواداری اس لیے بظاہر امن اور آزادی کے حصول اور تکمیل کے متعلق ہوشمند انسانوں میں اختلاف کی گنجائش نہ ہونا چاہیے لیکن بدقسمتی سے یوں نہیں ہے کہ انسانیت کی ابتدا سے اب تک ہر عہد اور ہر دور میں متضاد عوامل اور قوتیں برسرِ عمل اور برسرِ پیکار رہی ہیں۔ یہ قوتیں ہیں تخریب و تعمیر، ترقی اور زوال، روشنی اور تیرگی، انصاف دوستی اور انصاف دشمنی کی قوتیں یہی صورت آج بھی ہے اور اسی نوعیت کی کشمکش آج بھی جاری ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آج کل انسانی مسائل اور گزشتہ دور کی انسانی الجھنوں میں کئی نوعیتوں سے بھی فرق ہے۔ دورِ حاضر میں جنگ سے دو قبیلوں کا باہمی خون خرابہ مراد نہیں ہے نہ آج کل امن سے خون خرابے کا خاتمہ مراد ہے۔ آج کل جنگ اور امن کے معنی ہیں امنِ آدم کی بقا اور فنا، بقا اور فنا ان دو الفاظ پر انسانی تاریخ کے خاتمے یا تسلسل کا دارومدار ہے۔ انہیں پر انسانوں کی سرزمین کی آبادی اور بربادی کا انحصار ہے۔ یہ پہلا فرق ہے دوسرا فرق یہ ہے کہ اب سے پہلے انسانوں کو فطرت کے ذخائر پر اتنی دسترس اور پیداوار کے ذرائع پر اتنی قدرت نہ تھی کہ ہر گروہ اور برادری کی ضرورتیں پوری طرح سے تسکین پا سکتیں اس لیے آپس میں چھین جھپٹ اور لوٹ مار کا کچھ نہ کچھ جواز بھی موجود ہے، لیکن اب یہ صورت نہیں انسانی عقل سائنس اور صنعت کی بدولت اس منزل پر پہنچ چکی ہے کہ جس میں سب تن بخوبی پل سکتے ہیں اور سبھی جھولیاں بھر سکتی ہیں۔ بشرطیکہ قدرت کے یہ بے بہا ذخائر پیداوار کے یہ بے اندازہ خرمن، بعض اجارہ داروں اور مخصوص طبقوں کی تسکین ہوس کے لیے نہیں، بلکہ جملہ انسانوں کی بہبود کے لیے کام میں لائے جائیں۔ اور عقل اور سائنس اور صنعت کی کل ایجادیں اور صلاحیتیں تخریب کے بجائے تعمیری منصوبوں میں صرف ہوں۔ لیکن یہ جب بھی ممکن ہے کہ انسانی معاشرے میں ان مقاصد سے مطابقت پیدا ہو اور انسانی معاشرے کے ڈھانچے کی بنائیں ہوس، استحصال اور

اجارہ داری کے بجائے انصاف، برابری، آزادی اور اجتماعی خوش حالی میں اٹھائی جائیں۔ اب یہ ذہنی اور خیالی بات نہیں عملی کام ہے اس عمل میں امن کی جدوجہد اور آزادی کی حدیں آپس میں مل جاتی ہیں۔ اس لیے کہ امن کے دوست اور دشمن اور آزادی کے دوست اور دشمن ایک ہی قبیلے کے لوگ، ایک ہی نوع کی قوتیں ہیں۔ ایک طرف وہ سامراجی قوتیں ہیں جن کے مفاد جن کے اجارے جبر اور حسد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتے اور جنہیں ان اجاروں کے تحفظ کے لیے پوری انسانیت کی بھینٹ بھی قبول ہے۔ دوسری طرف وہ طاقتیں ہیں جنہیں بنکوں اور کمپنیوں کی نسبت انسانوں کی جان زیادہ عزیز ہے۔ جنہیں دوسروں پر حکم چلانے کے بجائے آپس میں ہاتھ بٹانے اور ساتھ مل کر کام کرنے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ سیاست و اخلاق، ادب اور فن روزمردہ کی زندگی غرض کئی محاذوں پر کئی صورتوں میں تعمیر اور تخریب انسان دوستی اور انسان دشمنی کی یہ چپقلش جاری ہے۔ آزادی پسند اور امن پسند لوگوں کے لئے ان میں سے ہر محاذ اور ہر صورت پر توجہ دینا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کشمکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک بھی شدید اختلافات موجود ہیں جنہیں حال ہی میں آزادی ملی ہے۔ ایسے اختلافات ہمارے پاکستان اور ہمارے سب سے ہمسایہ ہندوستان میں موجود ہیں۔ بعض عرب ہمسایہ ممالک میں اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے اختلافات سے وہی طاقتیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو امن عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں ان اختلافات کے منصفانہ حل پر غور و فکر اور اس حل میں امداد دینا بھی لازمی ہے۔

اب سے کچھ دن پہلے جب سوویٹ فضاؤں کا تازہ کارنامہ ہر طرف دنیا میں گونج رہا تھا تو مجھے بار بار خیال آتا رہا کہ آج کل جب ہم ستاروں کی دنیا میں بیٹھ کر

اپنی ہی دنیا کا نظارہ کر سکتے ہیں تو چھوٹی چھوٹی کمینگیاں، خود غرضیاں، یہ زمین کے چند ٹکڑوں کو بانٹنے کی کوششیں اور انسانوں کی چند ٹولیوں پر اپنا سکہ چلانے کی خواہش کیسی بعید از عقل باتیں ہیں۔ اب جبکہ ساری کائنات کے راستے ہم پر کشادہ ہو گئے ہیں۔ ساری دنیا کے خزینے انسانی بس میں آ سکتے ہیں، تو کیا انسانوں میں ذی شعور، منصف مزاج اور دیانت دار لوگوں کی اتنی تعداد موجود نہیں ہے جو سب کو منوا سکے کہ یہ جنگی اڈے سمیٹ لو۔ یہ بم اور راکٹ، توپیں، بندوقیں سمندر میں غرق کر دو اور ایک دوسرے پر قبضہ جمانے کی بجائے سب مل کر تسخیر کائنات کو چلو۔ جہاں جگہ کی کوئی تنگی نہیں ہے، جہاں کسی کو کسی سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے، جہاں لامحدود فضائیں ہیں اور ان گنت دنیائیں۔ مجھے یقین ہے کہ سب رکاوٹوں اور مشکلوں کے باوجود ہم لوگ اپنی انسانی برادری سے یہ بات منوا کر رہیں گے۔

مجھے یقین ہے کہ انسانیت جس نے اپنے دشمنوں سے آج تک کبھی ہار نہیں کھائی اب بھی فتح یاب ہو کر رہے گی۔ اور آخر کار جنگ و نفرت اور ظلم و کدورت کے بجائے ہماری باہمی زندگی کی بنا وہی ٹھہرے گی، جس کی تلقین اب سے بہت پہلے فارسی شعر حافظ نے کی تھی

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی
مگر بنائے محبت کہ خالی از خلل است

فیض .... از فیض

اپنے بارے میں باتیں کرنے سے مجھے سخت وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سب بور لوگوں کا مرغوب شغل یہی ہے اس انگریزی لفظ کے لیے معذرت چاہتا ہوں لیکن اب تو ہمارے ہاں اس کے مشتقات بوریت وغیرہ بھی استعمال میں آنے لگے ہیں۔ اس لیے اب اسے اردو روزمرہ میں شامل سمجھنا چاہیے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے اپنے بارے میں قیل و قال بری لگتی ہے۔ بلکہ میں تو شعر میں بھی حتیٰ الامکان واحد متکلم کا صیغہ استعمال نہیں کرتا، اور میں کے بجائے ہمیشہ سے ہم لکھتا آیا ہوں۔ چنانچہ جب ادبی سراغرساں حضرات مجھ سے یہ پوچھنے بیٹھتے ہیں کہ تم شعر کیوں کہتے ہو تو بات کو ٹالنے کے لیے جو دل میں آئے کہہ دیتا ہوں۔ مثلاً یہ کہ بھئی میں جیسے بھی کہتا ہوں جس لیے بھی کہتا ہوں تم شعر میں خود ڈھونڈ لو، میرا سر کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن ان میں سے ڈھیٹ قسم کے لوگ جب بھی نہیں مانتے۔ چنانچہ آج کی گفتگو کی سب ذمہ داری ان حضرات کے سر ہے مجھ پر نہیں ہے۔

شعر گوئی کا واحد عذر گناہ تو مجھے نہیں معلوم۔ اس میں بچپن کی فضائے گردوپیش میں شعر کو چرچا، دوست احباب کی ترغیب اور دل کی لگی سبھی کچھ شامل ہے۔ یہ نقش فریادی کے پہلے حصے کی بات ہے جس میں 29-28 سے 35-34ء تک کی تحریریں شامل ہیں۔ جو ہماری طالب العلمی کے دن تھے۔ یوں تو ان سب اشعار کا قریب قریب ایک ہی ذہنی اور جذباتی واردات سے تعلق ہے اور اس واردات کا ظاہری محرک تو وہی ایک حادثہ ہے جو اس عمر میں اکثر نوجوان دلوں پر گزر جایا کرتا ہے۔ لیکن اب جو دیکھتا ہوں تو یہ دور بھی ایک دور نہیں تھا بلکہ اس کے بھی دو الگ

الگ حصے تھے جن کی داخلی اور خارجی کیفیت کافی مختلف تھی۔ وہ یوں ہے کہ 20 سے 30 تک کا زمانہ ہمارے ہاں معاشی اور سماجی طور سے کچھ عجب طرح کی بے فکری، آسودگی اور ولولہ انگیزی کا زمانہ تھا، جس میں اہم قومی اور سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نثر و نظم میں بیشتر سنجیدہ فکر و مشاہدہ کے بجائے کچھ رنگ رلیاں منانے کا سا انداز تھا شعر میں اولا حسرت موہانی اور ان کے بعد جوش، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی کی ریاست قائم تھی، افسانے میں یلدرم اور تنقید میں حسن برائے حسن اور ادب برائے ادب کا چرچا تھا نقش فریادی کی ابتدائی نظمیں خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو تہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں وغیرہ وغیرہ اسی ماحول کے زیر اثر مرتب ہوئیں اور اس فضا میں ابتدائے عشق کا تحیر بھی شامل تھا لیکن ہم لوگ اس دور کی ایک جھلک بھی ٹھیک سے نہ دیکھ پائے تھے کہ صحبت یار آخر شد۔ پھر دیس پر عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے۔ کالج کے بڑے بڑے بانکے تیس مار خاں تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے۔ یہ وہ دن تھے جب یکایک بچوں کی ہنسی بجھ گئی، اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور اچھی خاصی شریف بہو بیٹیاں بازار میں آ بیٹھیں۔ گھر کے باہر یہ حال تھا اور گھر کے اندر مرگ سوز محبت کا کہرام مچا تھا یکایک یوں محسوس ہونے لگا کہ دل و دماغ پر سب ہی راستے بند ہو گئے ہیں اور اب یہاں کوئی نہیں آئے گا اس کیفیت کا اختتام جو نقش فریادی کے پہلے حصے میں آخری نظموں کی کیفیت ہے ایک نسبتاً غیر معروف نظم پر ہوتا ہے، جسے میں نے یاس کا نام دیا تھا وہ یوں ہے

یاس

بربط ودل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل
بزم ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیف کوثر و تسنیم
زحمت گریہ و بکا بے سود
شکوہ بخت نارسا بے سود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے باب قبول
بے نیاز دعا ہے رب کریم
بجھ گئی شمع آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظار فضول رہنے دے
راز الفت نباہنے والے
بار غم سے کراہنے والے
کاوش بے حصول رہنے دے

34ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور 35ء میں میں نے ایم اے او کالج امرتسر میں ملازمت کر لی۔ یہاں سے میری اور میرے بہت سے ہمعصر لکھنے والوں

کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقاء صاحب زادہ محمود الظفر مرحوم اور ان کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے ہیں۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں، اس لیے کہ اس میں بہر حال گرد و پیش کے سبھی تجربات شامل ہوتے ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں یا مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں، خاص طور پر انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے۔ چنانچہ غم جاناں اور غم دوراں تو ایک ہی تجربے کے دو پہلو ہیں۔ اس نئے احساس کی ابتدا نقش فریادی کے دوسرے حصے کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ اور اگر آپ خاتون ہیں تو مرے محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سے محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن، مگر کیا کیجیے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سے محبت مری محبوب نہ مانگ

اس کے بعد تیرہ چودہ برس کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں میں گزرے اور پھر فوج، صحافت، ٹریڈ یونین وغیرہ میں گزارنے کے بعد ہم چار برس کے لیے جیل خانے چلے گئے۔ نقش فریادی کے بعد کی دو کتابیں دست صبا اور زنداں نامہ اسی جیل خانے کی یادگاریں ہیں۔ بنیادی طور سے تو یہ تحریریں انہیں ذہنی محسوسات اور معمولات سے منسلک ہیں جن کا سلسلہ مجھ سے پہلی سی محبت سے شروع ہوا تھا لیکن جیل خانہ عاشقی کی طرح خود ایک بنیادی تجربہ ہے، جس میں فکرونظر کا ایک آدھ نیا دریچہ خود بخود کھل جاتا ہے۔ چنانچہ اول تو یہ ہے کہ ابتدائے شباب کی طرح تمام حسیات یعنی Sensations پھر تیز ہو جاتی ہیں اور صبح کی پو، شام کے دھندلکے، آسمان کی نیلاہٹ، ہوا کے گداز کے بارے میں وہی پہلا سا تحیر لوٹ آتا ہے۔ دوسرے

یوں ہوتا ہے کہ باہر کی دنیا کا وقت اور فاصلے دونوں باطل ہو جاتے ہیں، نزدیک کی چیزیں بھی بہت دور ہو جاتی ہیں اور دور کی نزدیک اور فرد او دی کا تفرقہ کچھ اس طور سے مٹ جاتا ہے کہ کبھی ایک لمحہ قیامت معلوم ہوتا ہے اور کبھی ایک صدی کل کی بات ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ فراغت ہجراں میں فکر و مطالعہ کے ساتھ عروس سخن کے ظاہری بناؤ سنگھار پر توجہ دینے کی زیادہ مہلت ملتی ہے۔ جیل خانے کے بھی دو دور تھے۔ ایک حیدر آباد جیل کا جو اس تجربے کے انکشاف کا تحیر کا زمانہ تھا، ایک منٹگمری جیل کا جو اس تجربے سے اکتاہٹ اور تھکن کا زمانہ تھا ان دو کیفیتوں کی نمائندہ یہ دو نظمیں ہیں، پہلی دست صبا میں ہے اور دوسری زنداں نامہ میں ہے۔

زنداں نامہ کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحن زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامن آسماں پہ نقش و نگار

شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دست جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آب نجوم
نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل
سبز گوشوں میں نیلگوں سائے
لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں
موج درد فراق یار آئے
دل سے پیہم خیال کہتا ہے
اتنی شیریں ہے زندگی اس پل
ظلم کا زہر گھولنے والے

کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل
جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں
وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گل کریں تو ہم جانیں

❖❖❖

اے روشنیوں کے شہر

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اٹھتی، گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر
اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر
کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ
آج مرا دل فکر میں ہے
اے روشنیوں کے شہر
شبخوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رو
خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو
آج کی شب جب دیئے جلائیں اونچی رکھیں لو

زنداں نامے کے بعد کا زمانہ کچھ ذہنی افراتفری کا زمانہ ہے جس میں اپنا اخباری پیشہ چھٹا، ایک بار جیل خانے گئے۔ مارشل لاء کا دور آیا اور ذہنی اور گردوپیش کی فضا میں پھر سے کچھ انسداد راہ اور کچھ نئی راہوں کی طلب کا احساس پیدا ہوا اس سکوت

اور انتظار کی آئینہ دار ایک نظم ہے شام اور ایک نامکمل غزل کے چند اشعار

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہو گی!

فیض



یہ خوں کی مہک ہے کہ لب یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو



دست تہ سنگ آمدہ

بیزار فضا، درپے آزار صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدم دیرینہ خفا ہے
ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روش آب و ہوا ہے
امڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے
وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہر ہلاہل سے سوا ہے
ہاں جام اٹھاؤ کہ بیاد لب شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے
اس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے
مقصود رہ شوق وفا ہے نہ جفا ہے
احساس غم دل جو غم دل کا صلا ہے
اس حسن کا احساس ہے جو تیری عطا ہے
ہر صبح گلستاں ہے ترا روئے بہاریں
ہر پھول تری یاد کا نقش کف پا ہے
ہر بھیگی ہوئی رات تری زلف کی شبنم
ڈھلتا ہوا سورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرف تمنا ترے قدموں کی صدا ہے

تعزیر سیاست ہے، نہ غیروں کی خطا ہے
وہ ظلم جو ہم نے دل وحشی پہ کیا ہے

زندان رہ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے، نہ کوئی بند بپا ہے

مجبوری و دعوٰی گرفتاری الفت
دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا ہے

❖❖❖

میخانوں کی رونق ہیں، کبھی خانقہوں کی
اپنا لی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلداری واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رند خرابات ولی ہے



سفرنامہ

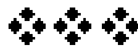




پیگنگ

یوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن دشت و چمن کی حد ہے

میرے کیسے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنان گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزہ کن فیکوں

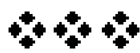


(۲)

سنکیانگ

اب کوئی طبل بجے گا، نہ کوئی شاہسوار
صبحدم موت کی وادی کو روانہ ہو گا!
اب کوئی جنگ نہ ہو گی نہ کبھی رات گئے
خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہو گا

کوئی دل دھڑکے گا شب بھر نہ کسی آنگن میں
وہم منحوس پرندے کی طرح آئے گا
سہم، خونخوار درندے کی طرح آئے گا
اب کوئی جنگ نہ ہو گی مئے و ساغر لاؤ
خوں لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہو گا
ساقیا! رقص کوئی رقص صبا کی صورت
مطربا! کوئی غزل رنگ حنا کی صورت



بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام

چھلک رہی ہے ترے حسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبا لب ہر اک نگاہ کا جام

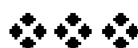
گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی باہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب
ہر ایک روئے حسیں ہو چلا ہے بیش حسیں

ملے کچھ ایسے، جدا یوں ہوئے کہ فیض اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا وہ گل ہے، داغ نہیں

ہانگ چاؤ (چین)

جولائی 1954ء



جشن کا دن

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے

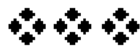
تنگ مزاج ہے ساقی نہ رنگ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیز رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

ہے انتظار ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

وہ شورش غم دل جس کی لے نہیں کوئی
غزل کی دھن میں سناؤ کہ جشن کا دن ہے

مارچ 1957ء



رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دل عشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

❖❖❖

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

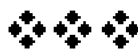
اپریل 1957ء



شام

اس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اجڑا ہوا، بے نور پرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام، ہر اک در کا دم آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے، ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے
اس طرح ہے کہ پس پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام
دامن وقت سے پیوست ہے یوں دامن شام
اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہو گا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہو گا

آسماں آس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چپ کی زنجیر کٹے، وقت کا دامن چھوٹے
دے کوئی سنکھ دہائی، کوئی پایل بولے
کوئی بت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے



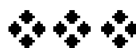
جمے گی کیسے بساط یاراں کے شیشہ و جام بجھ گئے ہیں
سجے گی کیسے شب نگاروں کہ دل سر شام بجھ گئے ہیں

وہ تیرگی ہے رہ بتاں میں چراغ رخ ہے نہ شمع وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ اے مہ شب غم، نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے، کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشن رنگ و نغمہ
وہ گل سر شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تہ دام بجھ گئے ہیں



تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں!

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی!
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اترا نہ میداں میں، دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی، نہ کوئی علم

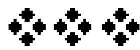
منتشر دوستوں کو صدا دے سکا
اجنبی دشمنوں کا پتا دے سکا
تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی!
جس میں رکھا نہیں ہم نے اب تک قدم
تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارا نہیں
جسم خستہ ہے، ہاتھوں میں یارا نہیں

اپنے بس کا نہیں بار سنگ ستم
بار سنگ ستم، بار کہسار غم
جس کو چھو کر سبھی اک طرف ہو گئے
بات کی بات میں ذی شرف ہو گئے

دوستو، کوئے جاناں کی نامہرباں

خاک پر اپنے روشن لہو کی بہار
اب نہ آئے گی کیا؟ اب کھلے گا نہ کیا
اس کفِ نازنیں پر کوئی لالہ زار؟
اس حزیں خامشی میں نہ لوٹے گا کیا
شورِ آوازِ حق نعرۂ گیر و دار
شوق کا امتحاں جو ہوا سو ہوا
جسم و جاں کا زیاں جو ہوا سو ہوا
سود سے پیشتر ہے زیاں اور بھی
دوستو، ماتمِ جسم و جاں اور بھی
اور بھی تلخ تر امتحاں اور بھی

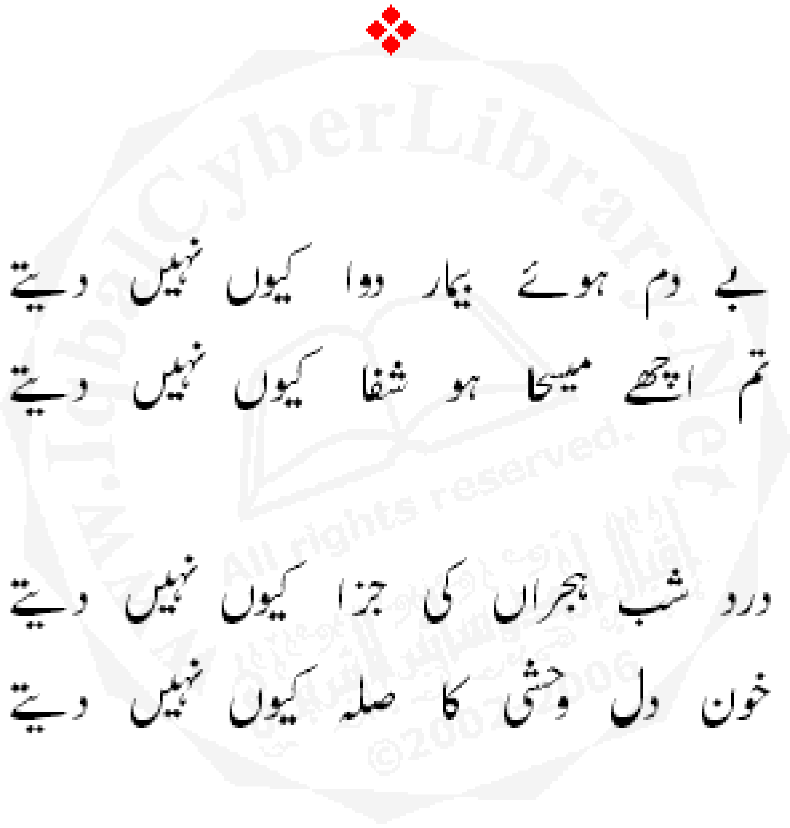
جنوری1958ء



نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکین نہیں اور آس بہت ہے
امیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اداس بہت ہے



❖



بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

درد شب ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خون دل وحشی کا صلہ کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گروساز صدا کیوں نہیں دیتے

پیمان جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادی دل جبر نہیں فیض کسی کا
وہ دشمن جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

لاہور جیل

31 دسمبر 1958ء



شورِ زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرام دور و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورش زنجیر بسم اللہ

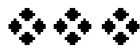
درِ زنداں پہ بلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے، پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ

گنو سب داغ دل کے، حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمارِ نالۂ شب گیر بسم اللہ

ستم کی داستاں، کشتہ دلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھےوہ سب کچھ برملا کہیے
مصر ہے محتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیے
لگی ہے حرفِ نا گفتہ پر اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحان عشق کی تدبیر بسم اللہ

لاہور جیل

جنوری 1959ء



آج بازار میں پابجولاں چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پابجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

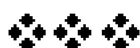
حاکمِ شہر بھی، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی

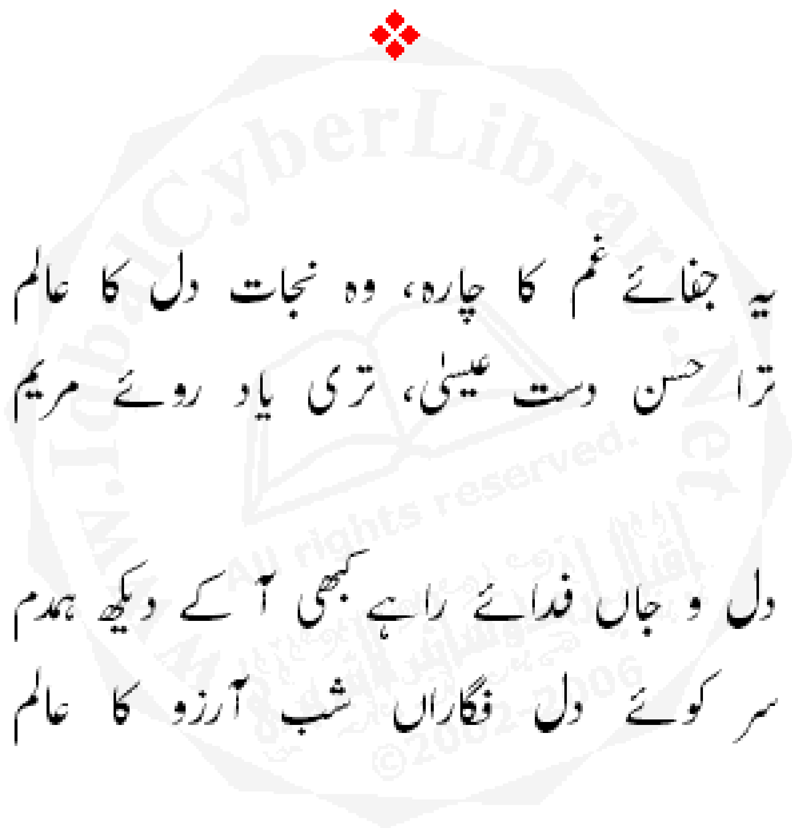
ان کا دم ساز اپنے سوا کون ہے
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

لاہور جیل

11 فروری 1959ء





یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجات دل کا عالم
ترا حسن دست عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

دل و جاں فدائے راہے کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سر کوئے دل فگاراں شب آرزو کا عالم

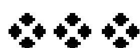
تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں
وہ چمن جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

لو سنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصل گل کا ماتم

لاہور جیل

فروری 59ء

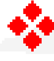


قید تنہائی

دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر
خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آباد جدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دل میں بھری اپنی صبوحی میں نے
گھول کر تلخی دیروز میں امروز کا زہر
دور آفاق پہ لہرائی کوئی نور کی لہر
آنکھ سے دور کسی صبح کی تمہید لیے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت
بے خبر گزری، پریشانی امید لیے
گھول کر تلخی دیروز میں امروز کا زہر
حسرت روز ملاقات رقم کی میں نے
دیس پردیس کے یاران قدح خوار کے نام
حسن آفاق، جمال لب و رخسار کے نام

زندان قلعہ لاہور

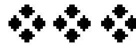
مارچ 1959ء



ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشت خاک جگر، ساغر میں ہے خون حسرت مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام الٹائے دیتے ہیں

قلعہ لاہور

مارچ 1959ء



زندگی

ملکہ شہر زندگی تیرا
شکر کس طور سے ادا کیجے
دولت دل کا کچھ شمار نہیں
تنگ دستی کا کیا گلہ کیجے

جو ترے حسن کے فقیر ہوئے
ان کو تشویش روزگار کہاں؟
درد بیچیں گے گیت گائیں گے
اس سے خوش وقت کاروبار کہاں؟

جام چھلکا تو جم گئی محفل
منت لطف غم گسار کسے؟
اشک ٹپکا تو کھل گیا گلشن
رنج کم ظرفی بہار کسے؟

خوش نشیں ہیں کہ چشم و دل کی مراد

دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں

ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے

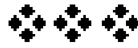
کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی

نقد شمس و قمر کی بات کرے

جس کو شوق نبرد ہو ہم سے

جائے تسخیر کائنات کرے

جون59ء



ترے غم کو جاں کی تلاش تھی ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سر رہگزار چلے گئے

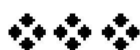
تری کج ادائی سے ہار کے شب انتظار چلی گئی
مرے ضبط حال سے روٹھ کر مرے غم گسار چلے گئے

نہ سوال وصل، نہ عرض غم، نہ حکایتیں نہ شکایتیں
ترے عہد میں دل زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سر رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر بزم یار چلے گئے

نہ رہا جنون رخ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرم عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

جولائی 1959ء



❖

آ گئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سل گئے ہونٹ، کوئی زخم سلے یا نہ سلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کھل گئے زخم، کوئی پھول کھلے یا نہ کھلے

اپریل 1966ء

❖❖❖

❖

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات ان دنوں
کھلتی ہے صبحِ گل کی طرح رنگ و بو سے پر
ویراں ہیں جام پاس کرو کچھ بہار کا
دل آرزو سے پر کرو، آنکھیں لہو سے پر

❖❖❖

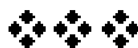
کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہو گی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہو گی

کب جان لہو ہو گی، کب اشک گہر ہو گا
کس دن تری شنوائی اے دیدہ تر ہو گی

کب مہکے گی فصل گل، کب بہکے گا میخانہ
کب صبح سخن ہو گی، کب شام نظر ہو گی

واعظ ہے نہ زاہد ہے، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہو گی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامت جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہو گی

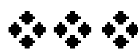


دو مرثیے

(۱)

ملاقات مری

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ دام
راستے بجھ گئے رخصت ہوئے رہ گیر تمام
اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات مری
اک ہتھیلی پہ حنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اک نظر زہر لیے ایک نظر میں دارو
دیر سے منزلِ دل میں کوئی آیا نہ گیا
فرقتِ درد میں بے آب ہوا تختۂ داغ
کس سے کہیے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ
اور پھر خود ہی چلی آئی ملاقات مری
آشنا موت جو دشمن بھی ہے غم خوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

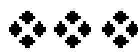


(۲)

ختم ہوئی بارشِ سنگ

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اب کسی سمت اندھیرا نہ اجالا ہو گا
بجھ گئی دل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو! قافلۂ درد کا اب کیا ہو گا
اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لیے ہے لبِ دلدار کا رنگ
کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

نومبر 1920ء



ان دنوں رسم و رہ شہر نگاراں کیا ہے
قاصدا، قیمت گلگشت بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آج کل صورت بربادی یاراں کیا ہے





آج یوں موج در موج غم تھم گیا اس طرح غم زدوں کو قرار آ گیا
جیسے خوشبوئے زلف بہار آ گئی جیسے پیغام دیدار یار آ گیا

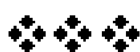
جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم رو برو پھر سر رہگزار آ گیا
صبح فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمر رفتہ ترا اعتبار آ گیا

رت بدلنے لگی رنگ دل دیکھنا، رنگ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا اشک امڈے کہ ابر بہار آ گیا

خون عشاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے، داغ جلنے لگے
محفل درد پھر رنگ پر آ گئی، پھر شب آرزو پر نکھار آ گیا

سر فروشی کے انداز بدلے گئے، دعوت قتل پر مقتل شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آ گیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آ گیا

فیض کیا جانئے یار کس آس پر، منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
میکشوں پر ہوا محتسب مہرباں، دل فگاروں پہ قاتل کو پیار آ گیا



کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدہ نمناک سے باری باری
سب ستارے سر خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی، ترک مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی!
ترک دنیا کا سماں، ختم ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دل آواہ کہاں جاؤ گے
اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں، رہنے دو
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس طرح کہ پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دل آوارہ کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے
اور ہر کشتۂ واماندگیِ آخرِ شب
بھول کر ساعتِ درماندگیِ آخرِ شب
جان پہچان ملاقات پہ اصرار کرے

دسمبر 1961ء

❖❖❖



یک بیک شورشِ فغاں کی طرح
فصلِ گُل آئی امتحاں کی طرح

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

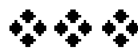
پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پُر ہوا جامِ ارغواں کی طرح

یاد آیا جنونِ گم گشتہ
بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح

جانے کس پر ہو مہرباں قاتل
بے سبب مرگِ ناگہاں کی طرح

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

مئی 1926ء



شہر یاراں

آسماں کی گود میں دم توڑتا ہے طفل ابر
جم رہا ہے ابر کے ہونٹوں پہ خوں آلود کف

بجھتے بجھتے بجھ گئی ہے عرش کے حجروں میں آگ
دھیرے دھیرے بچھ رہی ہے ماتمی تاروں کی صف

اے صبا شاید ترے ہمراہ یہ خوفناک شام
سر جھکائے جا رہی ہے شہر یاراں کی طرف

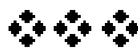
شہر یاراں جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت
شیر دل بانکوں میں اپنے تیر و نشتر کے ہدف

اک طرف بجتی ہے جوش زیست کی شہنائیاں
اک طرف چنگھاڑتے ہیں اہرمن کے طبل و دف

جا کے کہنا اے صبا، بعد از سلام دوستی
آج شب جس دم گزر ہو شہر یاراں کی طرف

دشت شب میں اس گھڑی چپ چاپ ہے شاید رواں
ساقی صبح طرب، نغمہ بلب، ساغر بکف

وہ پہنچ جائے تو ہو گی پھر سے برپا انجمن
اور ترتیب مقام و منصب و جاہ و شرف



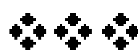
نہ گنواؤ ناوک نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تن داغ داغ لٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سر کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا

ادھر ایک حرف کہ کشتنی یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سن کے اڑا دیا جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا

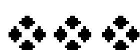
جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا



خوشا ضمانت غم

دیار یار تری جوشش جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامان تار تار کی خیر
رہ یقیں تری افشان خاک و خوں پہ سلام
مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خانہ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدۂ پرنم کی آب و تاب کی خیر
رواں رہے یہ روایت، خوشا ضمانت غم
نشاط ختم غم کائنات سے پہلے
ہر اک کے ساتھ رہے دولت امانت غم
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے
سکوں ملے نہ کبھی تیرے پافگاروں کو
جمال خون سر خار کو نظر نہ لگے
اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو
جلال فرق سردار کو نظر نہ لگے

لندن 1962ء



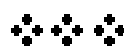
جب تیری سمندر آنکھوں میں

(گیت)

یہ دھوپ کنارا، شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے، پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک
یہ میل ہمارا، جھوٹ نہ سچ
کیوں زار کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سکھ سوئیں گے گھر در والے
اور راہی اپنی رہ لے گا

(لندن سے)

1963ء



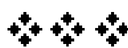
رنگ ہے دل کا مرے

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر، راہگزر شیشۂ مے شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگِ فلک
رنگ ہے دل کا مرے خونِ جگر ہونے تک
چمپئی رنگ کبھی راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتوں کا، خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رت، کوئی شے ایک جگہ پر ٹھہرے،
پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

(ماسکو)

اگست 1963ء



پاس رہو

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہمِ مشک لیے، نشترِ الماس لیے
بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کے رہ تکنے لگیں
آس لیے
اور بچوں کے بلکنے کی طرح قلقلِ مے
بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے

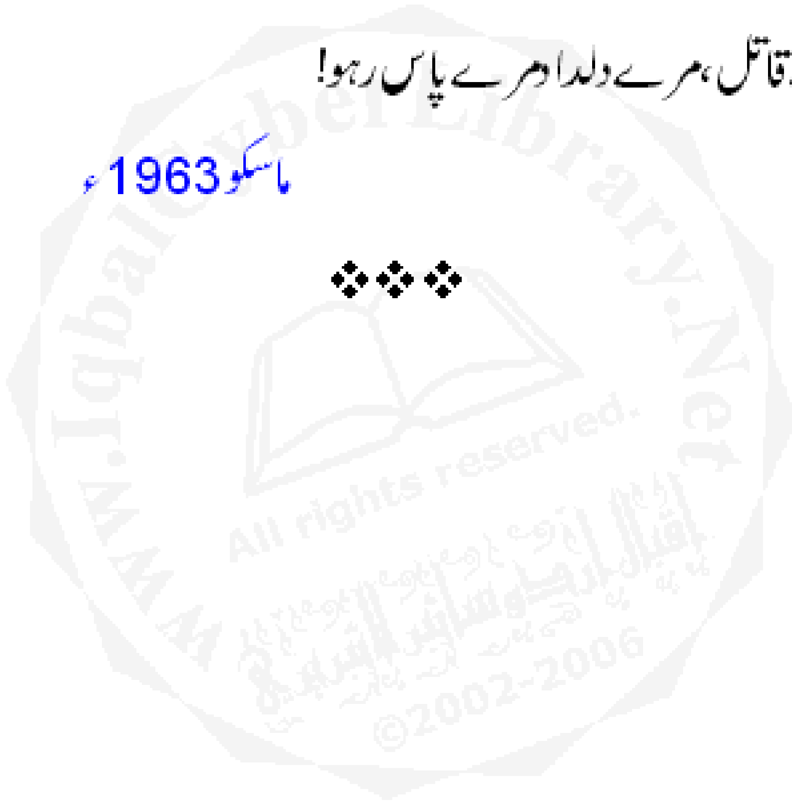
جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے

پاس رہو

میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو!

ماسکو 1963ء

❖❖❖



تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت، نہ دن کو شب سے ہے

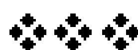
کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

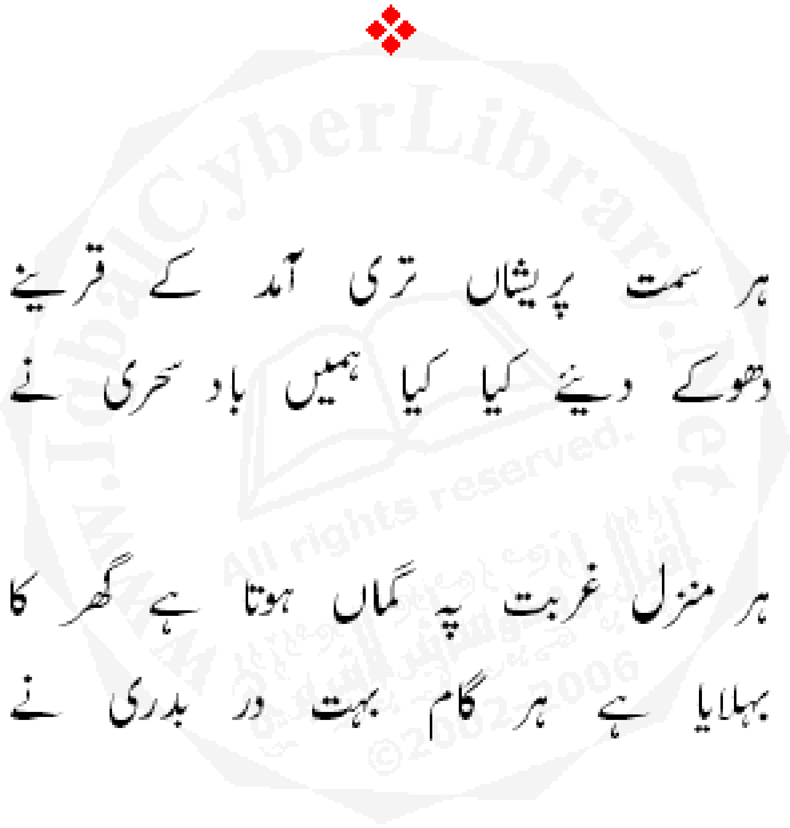
ہوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

بمبئی 1957ء





ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے

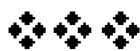
ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے

تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بیکار جلایا ہمیں روشن نظری نے

مے خانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے

یہ جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی فیض، کبھی بخیہ گری نے

لندن 1962ء



شرح فراق، مدح لب مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

یار آشنا نہیں کوئی، ٹکرائیں کس سے جام
کس دل ربا کے نام پہ خالی سبو کریں

سینے پہ ہاتھ ہے، نہ نظر کو تلاش بام
دل ساتھ دے تو آج غم آرزو کریں

کب تک سنے گی رات، کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے روبرو کریں

ہمدم حدیث کوئے ملامت سنائیو
دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں

آشفتہ سر ہیں، محتسبو، منہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکر دل و جاں عدو کریں

تر دامنی پہ شیخ، ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

❖❖❖

منظر

رہ گزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا، آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چپکے سے تیرا، کسی پتے کا حباب
ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا، آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ
شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش
آپ ہی آپ بنا اور مٹا آہستہ

دل نے دہرایا کوئی حرفِ وفا، آہستہ
تم نے کہا آہستہ
چاند نے جھک کے کہا
اور ذرا آہستہ

ماسکو 1964ء

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ -- اختتام ---- حصہ اول -- ❖ ❖ ❖ ❖ ❖